فہرست کتب

سید صباح الدین عبدالرحمن، بلند پایہ محقق، مورخ، ادیب اور نقاد تھے، انھوں نے ۴۰ کے قریب کتابیں تصنیف کیں اور سینکڑوں مضامین اردو انگریزی زبانوں میں لکھے ۔ ان تمام کی تفصیل تو یہاں ممکن نہیں ہے، البتہ چند اہم تصانیف کی فہرست دی جا رہی ہے۔ سید صاحب کی جملہ تصانیف اور مضامین کی ایک کتابیات زیر تکمیل ہے ان شاء اللہ آئندہ فکرونظر کے کسی شمارے میں نذر قارئین کی جائے گی ۔

سید احمد ظفر

۱ ۔ اسلام میں مذہبی رواداری
اعظم گڑھ : دار المصنفین ۔

۲ ۔ امیر خسرو دھلوی : حیات اور شاعری
(ایک تنقیدی جائزہ) اسلام آباد :
ادارہ تحقیقات اسلامی، ۱۹۷۹ء
۵۰ ص ۔

۳ ۔ بزم تیموریہ
اعظم گڑھ : مطبع معارف، ۱۹۴۸ء
۳۶۴ ص ۔

۴ ۔ بزم صوفیہ
تیموری عہد سے پہلے کے صوفیہ کے
حالات و تعلیمات کی تفصیل،

اعظم گڑھ : مطبع معارف، ١٣٦٩ھ
٥٢٠ ص ۔

٥ ۔ بزم مملوکیہ
اعظم گڑھ : مطبع معارف ، ١٩٥٥ء،
٣٣٩ ص ۔

٦ ۔ سلسلہ اسلام اور مستشرقین
اعظم گڑھ : دار المصنفین
(فروری ١٩٨٢ء میں اسلام اور مستشرقین کے موضوع پر دار المصنفین کے اہتمام میں جو بین الاقوامی سیمینار ہوا تھا، اس سلسلے میں اب تک پانچ جلدیں مرتب کرکے شائع کی جا چکی ہیں) ۔

٧ ۔ سلسلہ مذہبی رواداری،
اعظم گڑھ : دار المصنفین،
٣ ج ۔

٨ ۔ عہد مغلیہ مسلمان و ہندو مورخین کی نظر میں ،
اعظم گڑھ ، مطبع معارف
حصہ اول (٥٢٦ ص)

٩ ۔ غالب : مدح و قدح کی روشنی میں ،
اعظم گڑھ : معارف پریس، ١٩٧٩ء،
٢ ج ۔

١٠ ۔ مقالات سلیمان (تاریخی) .
اعظم گڑھ : مطبع معارف، ١٩٦٦ء،
ج ١ (٣٣٦ ص)

١١ ۔ مولانا سید سلیمان ندوی کی تصانیف (ایک مطالعہ)
اعظم گڑھ : دار المصنفین، ١٩٨٧ء ۔

١٢ ۔ ہندوستان امیر خسرو کی نظر میں:

ہندوستان سے متعلق امیر خسرو کے جذبات وتاثرات و
محسوسات ایک دلآویز مرقع،
اعظم گڑھ۔ مطبع معارف
۱۳۴ ص ۔

۱۳ ۔ ہندوستان کی بزم رفتہ کی سچی کہانیاں .
اعظم گڑھ : مطبع معارف، ۱۹۶۸ء ،
۲۴۳ ص ۔

۱۴ ۔ ہندوستان کے سلاطین، علما اور مشائخ کے تعلقات پر ایک
نظر.
اعظم گڑھ : دار المصنفین ، ۱۹۶۴ء،
۲۲۸ ص ۔

۱۵ ۔ ہندوستان کے عہد وسطی کا فوجی نظام .
اعظم گڑھ : معارف پریس، ۱۹۶۰ء،
۴۹۲ ص ۔

۱۶ ۔ ہندوستان کے عہد ماضی میں مسلمان
حکمرانوں کی مذہبی رواداری،
اعظم گڑھ : مطبع معارف، ۱۹۷۵ء،
ج ۱ (۱۴۷ ص) ۔

۱۷ ۔ ہندوستان کے عہد وسطی کی ایک جھلک :
تیموری عہد سے پہلے کے مسلمان حکمرانوں
کی سیاسی، تمدنی و معاشرتی تاریخ،
اعظم گڑھ : مطبع معارف،
۵۲۴ ص ۔

۱۸ ۔ ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے تمدنی جلوے .
اعظم گڑھ : معارف پریس، ۱۹۶۳ء،
۶۲۳ ص ۔

●●●

حدود و تعزیرات
اور
قصاص و دیت(فقه جعفری)

ترتیب و تدوین : ڈاکٹر سیّد علی رضا نقوی

صفحات : 472 ($7'' \times 9$) قیمت 85.00 روپے

زیر نظر کتاب ادارہ تحقیقات اسلامی کے تراجم مصادر اسلامی کے سلسلہ کی چھٹی تالیف ہے جو حدود و تعزیرات اور قصاص و دیت کے مسائل سے متعلق اثنا عشری مسلک کی آراء اور نظریات پر مشتمل ہے اس کی تدوین میں اس مسلک کی امہات الکتب کو سامنے رکھا گیا ہے۔ کتاب کے شروع میں موضوعات و محتویات اور آخر میں اسماء رجال، اسماء کتب اور مصطلحات کی فہارس شامل ھیں۔

مولانا نجم الحسن کراروی نے اشاعت سے قبل کتاب کا مسودہ ملاحظہ فرما کر اسے وکلاء علما اور ارکان عدلیہ کے لئے انتہائی مفید اور کارآمد قرار دیا۔

وفاقی شرعی عدالت کے سابق چیف جسٹس جناب جسٹس آفتاب حسین اور سپریم کورٹ کے شرعی اپیل بنچ کے جسٹس پیر کرم شاہ الازہری نے بھی ادارہ کی اس کوشش کو سراھا ہے۔

سرکولیشن منیجر، ادارہ تحقیقات اسلامی پوسٹ بکس نمبر ۱۰۳۵،
اسلام آباد۔ پاکستان۔

مولانا صباح الدین عبدالرحمن

مؤلفات پر ایک نظر

حکیم محمد سعید

آج سیّد صباح الدین عبدالرحمن ہمارے درمیان نہیں رہے، لیکن علم و ادب، تاریخ و تحقیق، تحریر و صحافت اور تصنیف و تالیف کے ایوانوں میں ان کی گونج ہمیشہ سنائی دیتی رہے گی ۔ وہ اپنے ذاتی اور انفرادی دائرے سے نکل کر ایک ایسے علمی و تحقیقی مرکز کے نمائندے بن چکے تھے جس نے برصغیر ہی نہیں بلکہ جنوبی ایشیا میں مسلمانوں کی نشاۃ و نہضت میں تاریخ ساز کردار ادا کیا اور جدید منہاج علم و فکر کی ایک ایسی ہمہ گیر تحریک سے روشناس کرایا جو ثقافت ، تمدن ، اور تہذیبی روایات کے سائنٹفک شعور پر مبنی تھی ۔ دبستان شبلی کی اسی خصوصیت کا نمائندہ ادارہ دارالمصنفین اعظم گڑھ ہے جس کے سربراہ گزشتہ ۱۹ سال سے مولانا سیّد صباح الدین عبدالرحمن مرحوم تھے اور دبستان شبلی کے جملہ خصائص ان کی ایک ذات میں جمع ہو گئے تھے ۔ وہ تقریباً ۱٦ عظیم اور شہرہ آفاق کتابوں کے مصنف تھے ۔ بہ ظاہر سیر و سوانح، تاریخ و ادب تحقیق و تنقید جیسے مختلف موضوعات کی کتابیں معلوم ہوتی ہیں، لیکن اگر بہ نظر غائر ان کا مطالعہ کیا جائے اور روح و مزاج کے اعتبار سے جائزہ لیا جائے تو مصنف کے ذہن

کے حوالے سے یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ ساری کتابوں کا موضوع ایک اور صرف ایک ہے اور وہ ہے اسلام اور مسلمانوں کے تمدن کی آفاق گیر وسعت اور تاریخی دلائل کی روشنی میں اس حقیقت کا اثبات ۔

بادی النظر میں یہ کام کچھ زیادہ دشوار نہیں معلوم ہوتا، لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے اور اس سے عہدہ برآ ہونے کا عزم رکھنے والے محققین سے نکتہ رس ذہن وسیع مطالعہ اور مشرق و مغرب کے تمام تاریخی سرمائے پر گہری نظر کا تقاضا کرتا ہے۔ یہ پس منظر اگر ذہن میں رکھا جائے تو شاید کام کی اہمیت اور وسعت کا زیادہ صحیح اندازہ ہو سکے گا ۔

مغرب نے علمی میدانوں میں ہمارے خلاف جو متعدد محاذ تیار کیے تھے ان میں ایک سب سے زیادہ خطرناک محاذ ایسا بھی تھا جس سے ہمارے تاریخی اور تمدنی حقائق کو مسخ کرنے کا سلسلہ بڑی تیزی سے جاری تھا ۔ دشواری یہ تھی کہ اس محاذ پر تنہا اہل مغرب ہی نہیں تھے بلکہ ہندو بھی ان کے حلیف بن گئے تھے اور ہمارے تمدن اور ہمارے طرز حیات کے بارے میں تاریخ کے نام پر یہ تاثر عام کرنے کی کوشش کر رہے تھے کہ اسلام اور مسلمانوں کا ارتقاء عالم انسانی کے حق میں عدل و مساوات، اخوت، شائستگی اور وسیع النظری کی اعلیٰ روایات کے ساتھ نہیں بلکہ ظلم، وحشت اور بربریت کے ساتھ ہوا ۔ مقصد یہ تھا کہ ہمارا ذہن اور ہمارا عقیدہ اپنی تہذیب اور اپنے تمدن کی بھیانک تصویر دیکھ کر اور اپنی تاریخ پر شرمسار ہوکر ہنود و نصاریٰ کے سامنے معذرت خواہانہ انداز سے سرنگوں ہو جائے اور وہ ضمیر و اعتقاد اور اسلاف کے علمی ورثے پر ہمارا اعتماد سلب کرنے میں کامیاب ہو جائیں، دنیا کو علمی اور سائنسی بنیادوں پر چیلنج کرنے والی سب سے بڑی قوم فکری محاذ پر پسپا ہو کر اپنے امتیازات کھو بیٹھے ۔

یہ تھا علمی محاذ اور اس کو عقبی منظر میں رکھـ کر کام کرنا تھا ـ چنانچہ مولانا صباح الدین کی ساری کتابیں اسی ذھنی پس منظر کے ساتھـ وجود میں آئیں اور اپنے تحقیقی منہاج اور منفـرد اسلوب کی بنا پر مقبول ھوئیں، ان مؤلفات کے مضامین و مشمولات پر دوست اور دشمن دونوں متوجہ ھوئے ـ یہ ان کے اخلاص اور ان کی علمیت کی فتح تھی ـ

قیام علی گڑھـ کے زمانے میں بھی انھیں اھل مغـرب کی اس معاندانہ روش کا احساس تھا اور وہ اس زمانے میں اکثر انگریزی مضامین میں ان موضوعات کو زیر بحث لاتے تھے مگر فکرونظر کی باقاعدہ تنظیم و تشکیل اس وقت ھوئی جب وہ ایم ـ اے کرنے کے بعد تحقیقی مقالے کی تدوین کے لیے دارالمصنفین بھیجے گئے ـ

سیّـد سلیمـان ندوی صاحـب سے خردی، بزرگی اور افـادۂ و استفادے کے تعلقات تو پہلے سے تھے مگر اب براہ راست رہ نمائی حاصل کرنے کا موقع ملا تو ان کی فکر منظم و مربوط ھو گئی اور ایک ایسے اسلوب نگارش سے وہ متعارف ھوئے جس میں آگھی، استدلال اور ذھنی بیداری کا پر تو نمایاں تھا ـ

موضوعی طور پر اس عظیم مصـنف کے سپرد جو کام تھـا وہ برصغیر کا اسلامی عہد تھا ـ اس سلسلے کی پہلی کتاب بزم تیموریہ تھی جو دو ضخیم جلدوں میں سامنے آئی اور پہلی بار یہ حقیقت مبرھن ھو کر نمایاں ھوئی کہ تیموری سلاطین، صرف علم پرور ھی نہیں تھے بلکہ زبان و ادب کے بھی محسن تھے اور ان کے عہد کو بجا طور پر علمی و ادبی اعتبار سے زرین عہد کہا جا سکتا ہے ـ اس کتاب میں سینکڑوں علماء اور مشائخ، شعراء، ادباء اوراصحاب تصنیف و تالیف کے ایسے تذکرے ھیں جن کو ھزاروں اھم کتابوں کا خلاصہ کہا جا سکتا ہے ـ کتاب کے تحقیقی مقام و مرتبے کا اندازہ

صرف اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ ایک ہندستانی دانشور کو محض اس کے فارسی ترجمے پر تہران سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری ملی، علاّمہ سیّد سلیمان ندوی ایک خط میں صباح الدین صاحب کو ان کی اس تصنیف کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں ۔

,,جو تصویر تم نے کھینچی ہے وہ نہایت عمدہ ہے اور مصور کے کمالات تعریف کے مستحق ہیں،،

مکتوب سیّد سلیمان ندوی بہ نام

سید صباح الدین

۳۰ دسمبر ۱۹۳۸ء

ایک ہی سال کے بعد ایک دوسری کتاب ,,بزم صوفیہ،، کے نام سے وجود میں آتی ہے جو اپنی علمی سطح کے اعتبار سے عام تذکرہ و تاریخ سے صرف بلند ہی نہیں بلکہ مواد تحقیق کے اعتبار سے مسلم تمدن کے مختلف موضوعات پر کام کرنے کے لئے اہم حوالے کی حیثیت بھی رکھتی ہے ۔ اس میں مشائخ اور صوفیہ کے صرف سیر و سوانح نہیں ہیں بلکہ ملفوظات میں موجود ان کی تعلیمات کے حوالے سے ان کے تبلیغی کارناموں اور نوع انسان کے لیے فلاحی خدمات کی مستند تفصیلات موجود ہیں ۔

تاریخ و تمدن کے مطالعے کے سفر میں ایک طالب علم کو جو طبقہ اپنے اثر و نفوذ اپنے فلسفہ و فکر اور اپنے عمل و کردار کے اعتبار سے نہایت ممتاز مقام پر نظر آتا ہے وہ بلاشبہ صوفیہ کا طبقہ ہے جس کا قابل ذکر علمی جائزہ یا تو پروفیسر نکلسن نے لیا یا پھر سیّد صباح الدین عبدالرحمن اور خلیق احمد نظامی نے ۔

اسی بزم صوفیہ کی بدولت ملفوظات ادب کی ہمہ جہت قدر و قیمت کا صحیح اندازہ ہوا اور ملفوظات کی علمی، افادی اور تاریخی حیثیت کا تعین بھی ہوا ۔

اس باب میں دور حاضر کے بعض مورخین کے تسامحات پر بھی فکر انگیز بحث ملتی ہے نیز مجموعی طور پر صوفیہ کے اسلامی کردار کی حقیقی تصویر نظر آتی ہے۔

چار سال کے وقفے کے بعد ۱۹۵۴ء میں بزم مملوکیہ کے نام سے ایک تیسری اہم کتاب منظر عام پر آئی ہے۔

ہمارے نزدیک مملوک خاندان کے سلاطین دو امتیازات کے لحاظ سے خصوصی اعتنا کے مستحق تھے، ایک تو ان کا نمایاں ذوق علم، دوسرے اسلامی منہاج حیات سے ان کی دلچسپی ۔ انھوں نے علم و ثقافت کی جو خدمات انجام دی تھیں ان کے مفصل جائزے کی ضرورت تھی، ان کی علم دوستی کی بنا پر ان کے عہد میں ایسے علما، شعرا اور ادبا نظر آتے ہیں جو اسلامی تمدن کے افق کے آفتاب و ماہتاب کہے جا سکتے ہیں ۔ مولانا منہاج سراج، مولانا شمس الدین خوارزمی، مولف فتاوی تاتار خانی، نیز امیر خسرو اور حسن سنجری اسی عہد کی شخصیات میں سے ہیں، اس لیے یہ کتاب آئینۂ صد رنگ بن گئی ہے اور صباح الدین صاحب کی محققانہ عظمت کی مکمل نمائندگی کرتی ہے۔

گیارہ سال کے طویل وقفے کے بعد دو جلدوں میں"ہندوستان کی بزم رفتہ کی سچّی کہانیاں، کے نام سے ایک دوسری کتاب معرض وجود میں آتی ہے جس میں مسلم سلاطین کے اخلاق کے اسلامی خط و خال کو نمایاں کیا گیا ہے اور ترویج علم، اشاعت علم، اور اصلاح معاشرہ کے سلسلے میں حساس احتسابی نظام کی خوبیوں کا جائزہ مستند تاریخی واقعات کے ساتھ لیا گیا ہے۔

تقریباً اسی زمانے میں ایک اور کتاب ,,ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے تمدنی جلوے،، کے نام سے سامنے آتی ہے جو اس حقیقت کو واضح کرتی ہے کہ مسلم سلاطین نے ہندوستان کو ایسے تمدنی

محاسن سے آراستہ کیا کہ پورا برصغیر اپنی ثقافتی رعنائیوں کے اعتبار سے جغرافیۂ عالم کا ممتاز ترین خطہ بن گیا اور یہ سب کچھ ان بادشاہوں نے مذہب و ملّت کے فرق و امتیاز کے بغیر کیا، اس لیے کہ اسلامی تعلیمات کی بدولت وہ وسیع النظری اور رواداری کی صفات سے آراستہ تھے ۔ ان تفصیلات کے لیے ایک مستقل کتاب ,,ہندوستان کے عہد ماضی میں مسلمانوں کی مذہبی روا داری،، لائق دید ہے جو ۱۹۷۵ء میں منظر عام پر آئی ۔

مسلم سلاطین کی عسکری حکمت عملی اور ہندوستان کے عہد وسطی کا فوجی نظام بھی ان کی تحقیق کا موضوع ہے جس سے مسلمانوں کی حربی تکنیک کا صحیح اندازہ ہوتا ہے ۔

اس کتاب میں محمد بن قاسم کے فوجی مراکز اور اس کی قائم کردہ متعدد فوجی چھاؤنیوں کی تفصیلات جس مورخانہ جزئیات نگاری کے ساتھ پیش کی گئی ہیں وہ مصنف کی بصیرت اور تلاش و تحقیق کے اعلیٰ نمونے کی حیثیت رکھتی ہیں ۔

یہ سیّد صباح الدین مرحوم کی تالیفات کا مکمل جائزہ نہیں، لیکن نمائندہ تصانیف پر ایک سرسری نظر ہے جسے سامنے رکھ کر ایک باشعور قاری یہ نتیجہ بہ خوبی اخذ کر سکتا ہے کہ مصنف کی فکر مربوط و منظم ہے اور ان کے خیال میں وحدت ہے ۔ تمام تخلیقات میں مرکز توجہ یہ نکتہ ہے کہ جادو ناتھ سرکار اور ایشوری پرشاد کے علاوہ مغربی مورخین اسلام اور اسلامی تاریخ اور مسلم تہذیب و تمدن سے متعلق جو غلط فہمیاں پھیلا رہے ہیں حقائق ان کے برعکس ہیں ۔ مسلمان جہاں بھی گئے انھوں نے قوموں کو علم و تہذیب کی لازوال دولت عطا کی اور ان کی فتح و کامرانی دراصل اخلاق و کردار اور علم و بصیرت کی فتح تھی ۔ ان کے عدل و انصاف اور ان کی رواداری سے معاشرے کو ایک ایسا نظام ملا تھا جس

میں احتسابی قوت ہمیشہ متحرک رہتی تھی اسی ایک مرکزی خیال کے جلوے ان کی مختلف مدلل اور اعلیٰ سطحی کتابوں میں نظر آتے ہیں اور یہ بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ مسلم تاریخ کو مسخ کرنے کا جو مذموم سلسلہ ہندو اور انگریز مورخین کی طرف سے شروع کیا گیا تھا ، اس محاذ پر علم و آگہی کے آلات سے لیس ہو کر صباح الدین مرحوم مسلم تاریخ و ثقافت کے ایک نکتہ شناس وکیل کی حیثیت سے ابھرے اور فکری عدالت کے ایوان پر چھا گئے ۔

جیسا کہ سطور ماقبل میں کہا جا چکا ہے کہ ابتداءً وہ انگریزی میں لکھتے تھے اور حیدرآباد کے مشہور عالم علمی جریدے اسلامک ریویو وغیرہ میں ان کے مضامین اکثر آتے رہتے تھے، لیکن دارالمصنفین سے تعلقات کے بعد علاّمہ سیّد سلیمان ندوی نے ان کو اردو میں مقالہ نگاری کی طرف متوجہ کیا ۔

مقالہ نگاری کے متعلق یہاں اس حقیقت کا اظہار بےمحل نہ ہوگا کہ یہ باقاعدہ تصنیف یا کسی موضوع پر مستقل کتاب پیش کرنے سے زیادہ مشکل کام ہے۔ اس لیے کہ مقالے میں اختصار، جامعیت اور علمیت کے ساتھ فکر انگیزی خصوصیت کے ساتھ بہت ضروری ہے اور اسلوب و زبان کی دلکشی و دل آویزی وہ لازمی صفت ہے جس کے بغیر علمیت اور فکرانگیزی کے عوامل بےاثر رہتے ہیں ۔

ایک مقالہ نگار کی حیثیت سے سیّد صباح الدین مرحوم نے بہت جلد نمایاں مقام حاصل کر لیا اس لیے کہ انگریزی ادب کے ساتھ ساتھ فارسی کی مکتبی تعلیم نے ان کی ذہنی استعداد کو پختہ تر کر دیا تھا اور عربی سے واقفیت نے اسے مزید جلا بخش دی تھی ۔ ذہن محققانہ تھا ہی، لہذا جب بھی کسی عنوان پر کوئی مضمون لکھتے تھے تو اس کا وزن،وقار علمی حلقوں میں پوری طرح محسوس کیا جاتا تھا ۔

علاّمہ سیّد سلیمان ندوی اپنے عہد ھی میں اکثر بین الاقوامی اور قومی سطح کے مذاکروں میں اپنے نمائندے کی حیثیت سے انھیں بھیجا کرتے تھے اور جو فکری نکات اپنے مقالے میں وہ پیش کرتے تھے وہ اھل علم کے لیے اتنے اچھوتے ھوتے تھے کہ متعدد گوشوں سے ان کو کتابی صورت میں پیش کرنے کا تقاضا کیا جاتا تھا، ان کی متعدد معرکہ آرا تصانیف ابتداءً مقالات کی صورت میں تھیں ، پھر معارف کے صفحات میں آئیں اور اھمیت کی بنا پر بعد کو کتاب کے قالب میں ڈھل گئیں ۔ امیر خسرو سے متعلق بیشتر کتابوں کا پس منظر یہی ہے اور دو سال پہلے پیر راشدی مرحوم کی علمی، ادبی اور تحقیقی خدمات پر ان کی جو کتاب راقم السطور کے مقدمے کے ساتھ شائع ھوئی ہے وہ بھی پہلے ایک جامع مضمون ھی کی صورت میں تھی اور ناظرین کو اس پر حیرت نہ ھونی چاھیے کہ وہ مضمون حضر نہیں بلکہ سفر میں دو دنوں کی مختصر مدت میں لکھا گیا تھا۔

اس سے ذھن کی بیداری، قلم پر قدرت اور مضامین و مواد کے استحضار کا پتا چلتا ہے ۔

چند سال ادھر کی بات ہے کہ دھلی کے ایک اعلیٰ سطحی علمی سیمنار میں انھوں نے ایک مقالہ بہ عنوان ,,ھندوستان کے سلاطین، علماء اور مشائخ کے تعلقات،، پر پیش کیا ۔

یہ تاریخ کا ایک نہایت معرکہ آرا باب ہے جس میں علماء اور مشائخ کو موثر حزب اختلاف اور زبردست قوت احتساب رکھنے والے گروہ کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے اور اقتدار سے سرزد ھونی والی لغزشوں پر ان کی بیباکانہ گرفت اور اصول دین سے انحراف کے رجحان پر خوف تعزیر سے بےنیاز ھو کر عناں گیری کی ولولہ انگیز مثالیں پیش کی گئی ھیں اور ساتھ ھی خود سلاطین کے بھی تعمیری کردار کو وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے ۔ یہ مقالہ اپنے اعتدال

مزاج کی وجہ سے خاص اہمیت رکھتا تھا ۔ اس لیے مولانا عبدالسلام قدوائی مرحوم اور برادر محترم جناب حکیم عبدالحمید صاحب مدظلہ، کے ایما سے مرتب نے اسے کتابی صورت میں پیش کیا اور تاریخ کا ایک اہم باب مسلمانوں کے نظام حکومت کی تمام مستحسن صفات کے ساتھ علمی انداز سے سامنے آیا ۔

ان کے مضامین و مقالات ہمیشہ معارف اور دیگر رسائل و جرائد میں آتے رہے، اور ایک بلند پایہ مضمون نگار کی حیثیت سے ان کے منفرد مقام و مرتبے کو ہر حلقے میں تسلیم کیا گیا، لیکن جب معارف کی ادارت کی خدمت انھیں تفویض کی گئی تو ان کی عظیم اور وسیع صلاحیتوں کا ایک نیا پہلو سامنے آیا اور وہ ہے علمی جرائد کی صحافت، جس سے وہ نہ صرف بہ خوبی عہدہ برآ ہوئے بلکہ معارف کو اس کی تمام خصوصیات کے ساتھ اس طرح باقی رکھا کہ اس کے معیار میں کبھی کوئی فرق نہیں آیا ۔

علمی حلقوں میں مضامین کے علاوہ خصوصیت کے ساتھ معارف کے دو ابواب بہت پسندیدگی کے ساتھ دیکھے جاتے ہیں ایک تو اداریہ جو ,,شذرات،، کے عنوان سے آتا ہے ۔ ,,شذرہ نگاری،، اب اردو صحافت میں مستقل حیثیت اختیار کر گئی ہے لیکن جن خصوصیات کی بنا پر مختلف علمی، ادبی، فکری اور قومی مسائل پر مختصر ادارتی نوٹ، ,,شذرات،، کی حیثیت اختیار کرتے ہیں، ان کا علمی نمونہ علاّمہ سیّد سلیمان ندوی نے معارف کے ذریعہ پیش کیا، وہ ایسے اسلوب نگارش پر قدرت بھی رکھتے تھے ۔ سیّد سلیمان ندوی مرحوم کے بعد بھی یہ خصوصیت برقرار رہی، لیکن جس آب و تاب کے ساتھ اس قالب میں سیّد صباح الدین عبدالرحمن نے اپنی انفرادیت کی روح پھونکی وہ اپنی مثال آپ ہے ۔

سیاست، مذہب، تمدن، معاشرت اور عصری مسائل پر ان کے شذرات بےحد فــکر انگیز متین، مدلل، اور بلیغ ہوتے تھے، زبان اور انداز نگارش سے سیّد سلیمان ندوی مرحوم کی یاد تازہ ہو جاتی تھی ۔

معارف کا دوسرا اہم باب ,,وفیات،، کا ہوتا ہے ۔ یہ عنوان خود سیّد صاحب مرحوم و مغفور نے قائم کیا تھا جس کے تحت ملک و ملّت کے مشاہیر و اکابر کی وفات پر تعزیت اور تاثرات پیش کرتے تھے ، لیکن ایسے جامع اور محیط انداز میں کہ شخصیت اور مقام و مرتبے کے ساتھ متوفی کی حیات، کارنامے اور ذاتی سیرت و کردار کا ہر گوشہ ســامنے آ جاتا تھا اور یہ ساری چیزیں معارف کے دو صفحات میں ہوتی تھیں، انھی خصوصیات کی بنا پر ,,وفیات،، کے تحت لکھے جانے والے سارے خاکے ,,یاد رفتگاں،، کے عنوان سے شائع ہو کر مبسوط و مفصــل مضامـین لکھنے والوں کے لیے مصدر و مرجع بن چکی ہیں ۔

سیّد صباح الدین عبدالرحمن مرحوم کا کمال یہ ہے کہ وفیات کے اس عنوان کے تحت پیش کیے جانے والے تاثرات اور شخصی خاکوں کو نہ صرف سیّد سلیمان ندوی مرحوم کے رنگ و آہنگ میں پیش کیا بلکہ اسے مزید ادبی دلکشی و دل آویزی اور مرقع نگاری کے حسن سے بھی آراستہ کیا ۔

اعلام القرآن کے ماہر، صاحب نظر مفسر اور متعدد زبانـوں کے عالم، مولانا ابوالجلال ندوی مرحوم کو علمی دنیا بھولی نہ ہوگی ۔ تین سال ہــوئے کہ کراچی میں ان کا انتقال ہوا سیّد صباح الدین مرحوم نے وفیات کے عنوان سے ان کے بارے میں جو کچھ لکھا وہ ان کی خاکہ نگاری کا بہترین نمونہ ہے ۔ چند سطور برائے ملاحظہ پیش خدمت ہیں :

,,جس موضوع پر بولتے سننے والوں پر اپنی غیر معمولـی ، علمی، تاریخی، ادبی اور مذہبی معلومات کا گہرا اثر پیدا کرتے۔

بعض اوقات جی چاهتا که وہ بولتے رهتے اور هم لوگ سنتے رهتے ۔ ان کی گفتگو قلم بند کر لی جاتی تو وہ علمی جواهر ریزے هوتے، لیکن یه علم و فن کی بڑی محرومی رهی که جب وہ کسی موضوع پر لکھنے بیٹھتے تو لکھتے چلے جاتے اور ان کے قلم کی روانی کہیں نہیں رکتی، یہاں تک که ایک موضوع پر دو ڈھائی سو صفحے لکھ جاتے، جس میں اپنی بے پناہ معلومات کی بنا پر موضوع سے هٹ کر بہت سی غیر متعلق باتیں بھی آ جاتیں، ذهن کی اسی انتشار پسندی کی وجه سے کسی موضوع پر کوئی خاص کتاب نه لکھ سکے، لیکن ان کی جو بھی تحریر معارف میں شائع هوتی اس پر اهل فن کی نگاه ضرور اٹھتی، معارف میں ان کے ایک مضمون کو پڑھ کر پیرس سے ڈاکٹر حمیدالله نے لکھ بھیجا تھا که ,,دارالمصنفین کے علمی افق پر یه کہاں سے درخشنده ستاره طلوع هوا ہے،،

معارف نومبر ۱۹۸۴ء

,,شذرات،، اور ,,وفیات نگاری،، نیز تصنیف و تالیف کتب کی ذمه داریوں کے ساتھ مختلف موضوعات پر مضمون نگاری کے فرض سے بھی وہ کبھی غافل نہیں رهے ۔

هندوستان کو جو مختلف تہذیب و ثقافت، عقیده مذهب رکھنے والی اقوام کا وطن ہے بہت سے مسائل کا سامنا ہے ۔ مسلمان جن غیرمنصفانه اقدامات سے براه راست متاثر هو رهے هیں ان کی فہرست بہت طویل ہے لیکن مسجد بابری کے قصّے نے جو هیجان پیدا کر دیا ہے اس کی مثال نہیں ملتی، اجودهیا کی اس قدیم مسجد کے بارے میں وهاں کی عدالت عالیه کے فاضل ججوں اور مورخوں نے جو موقف اختیار کر رکھا ہے اس کی تردید و تغلیط کی کوشش اعلیٰ علمی دلائل کے ساتھ بہت کم کی گئی تھی ۔ سیّد صباح الدین عبدالرحمن

مرحوم نے اپنے ایک نہایت فاضلانہ مضمون کے ذریعہ اس شرانگیز مغالطے کی ایسی پر زور علمی تردید کی کہ معاندین ساکت ہوگئے اور دلائل و براہین کے سامنے سب کو سر تسلیم خم کرنا پڑا فیصلہ گو معرض التوا میں ہے لیکن حقائق کی تردید اب تک نہیں ہو سکی۔

آج دارالمصنفین کا روشن ترین چراغ گل ہو چکا ہے لیکن یقین ہے کہ اس کی ضیا گستری اور نور افشانی سے افق علم و فکر ہمیشہ تاباں و درخشاں رہے گا اور تاریخ و تمدن کے علمی و قلمی محاذ پر عصر حاضر میں اسلام کے ایک ممتاز متکلم، صاحب طرز مصنف اور نکتہ شناس محقق کی حیثیت سے سیّد صباح الدین عبدالرحمن مرحوم نہ صرف ہند و پاک بلکہ بین الاقوامی دنیا میں بھی ہمیشہ احترام کے ساتھ یاد کیے جائیں گے۔ ان تصانیف نے شہرت اور بقائے دوام کے دربار میں ان کو وہ مقام عطا کر دیا ہے جس سے نابغۂ روزگار ہستیوں کو قدرت نوازا کرتی ہے۔

●●●

غالب

مدح و قدح کی روشنی میں

تبصرہ : ڈاکٹر خورشید رضوی

ابن خلکان نے ابوالفرج الاصبہانی کے بارے میں کہا تھا:

,,وله شعر یجمع اتقان العلماء و احسان الظرفاء الشعراء،،

,,اسکی شاعری میں علماء کی سی پختگی اور نکتہ داں شعرا کی سی جودت یکجا ہے،،

تحقیق اور تخلیق، علم اور ادب واقعی کسی ایک ذات میں مشکل سے جمع ہوتے ہیں ۔ برصغیر پاک و ہند میں علامہ شبلی نعمانی اس گروہ کمیاب کے نمائندہ ہیں ۔ وہ اعلی درجے کے عالم اور بلند پایہ محقق ہی نہ تھے ایک نغز گو شاعر اور ژرف بیں نقاد بھی تھے ۔ دارالمصنفین اعظم گڑھ کو یہ روایت ورثے میں ملی اور سید سلیمان ندوی اور شاہ معین الدین احمد سے ہوتی ہوئی سید صباح الدین عبدالرحمن تک پہنچی چنانچہ انھوں نے متعدد عالمانہ و محققانہ موضوعات کے پہلو بہ پہلو غالب اور خسرو پر بھی قلم اٹھایا ۔

,,غالب مدح و قدح کی روشنی میں،، کی دو ضخیم جلدیں ہمارے سامنے ہیں جو سلسلہ دارالمصنفین کے نمبر ۱۲۷ اور ۱۳۰ کے تحت یکے بعد دیگرے ۱۹۷۷ء اور ۱۹۷۹ء میں شائع ہوئیں ۔ پہلی جلد میں مرزا غالب کی زندگی سے لے کر ۱۹۲۸ء تک اور دوسری جلد میں ۱۹۲۹ء سے لے کر ۱۹۶۹ء تک (جب برصغیر میں غالب کا صد سالہ یادگار سیمینار منعقد کیا گیا)، غالب کی حمایت و مخالفت میں لکھی جانے والی تحریروں پر ناقدانہ تبصرہ کیا گیا ہے ۔

اس تالیف کی اولین تحریک ۱۹۶۸ء میں جناب سیماب اکبر آبادی کے صاحبزادے اور ,,شاعر،، کے ایڈیٹر جناب اعجاز صدیقی صاحب کی طرف سے ہوئی جسے گورنر یو ۔ پی جناب بی ۔ گوپالا ریڈی کے اظہار دل چسپی سے مزید تقویت ملی ۔ ,,معارف،، میں اس کا کچھ حصہ شائع ہوا تو جناب رشید احمد صدیقی نے اس میں خصوصی دل چسپی کا اظہار فرمایا اور اس سلسلے کو جاری رکھنے کی ضرورت پر زور دیا ۔ ان کا خیال تھا کہ اس کتاب کی تکمیل سے یونیورسٹیوں میں غالب کو سمجھنے میں بڑی مدد ملے گی اور یہ ,,اقبال کامل،، کی طرح مقبول ہو گی ۔ شبلی پوسٹ گریجویٹ کالج سے سید صباح الدین عبدالرحمن صاحب کی ریٹائرمنٹ پر یونیورسٹی گرانٹ کمیشن نے انھیں اردو ادب پر تحقیق کے سلسلے میں وظیفہ دیا جس کے لئے اس موضوع کی باقاعدہ منظوری عمل میں آ گئی ۔ اور اس وسیلے سے بالآخر یہ دونوں ضخیم جلدیں پایۂ تکمیل کو پہنچ گئیں ۔

بنیادی طور پر اگرچہ یہ کام تالیفی نوعیت کا تھا جس میں بہت سی پرانی تحریروں کو یکجا کرنا تھا ۔ تاہم، خود سید صباح الدین صاحب کے بقول، پرانی شراب کو نئے مینا و ساغر میں انڈیلنا بھی ایک بڑا فن ہے ۔ اکثر پرانی تحریریں نگاہوں سے یوں اوجھل اور حافظوں سے یوں محو ہو جاتی ہیں کہ ان کی بازیافت، نظارہ اولین سے کم سرور انگیز نہیں ہوتی ۔ چنانچہ مرزا کے معاصرین میں سے میر محمد خاں سرور، مصطفی خاں شیفتہ، نواب ضیاء الدین نیر، مولوی کریم الدین، سر سید احمد خان، امام بخش صہبائی، غلام غوث بیخبر، مولانا فضل حق، غلام علی وحشت، سید غوث علی قلندر، نواب جاورہ غوث محمد خاں بہادر، امجد سندیلوی، عزیز لکھنوی وغیرہ نے غالب کے بارے میں جو کچھ کہا وہ ریکارڈ

پر یقیناً موجود ہے لیکن بہت سے قارئین پر یہ سارا مواد پہلی بار سید صباح الدین عبدالرحمن ھی کی محنت سے منکشف ہوا ۔ بلکہ جو اھل نظر اس مواد کی لخت لخت تفصیلات سے واقف بھی تھے ان کے لئے بھی اس کا یــوں مرتب صورت میں یکجا سامنے آنا بصیـرت افروزی سے خالی نہ تھا ۔ کیونکہ اس سے موضوع کے تناظر میں ایک نیا عمق پیدا ہوا ۔ یہ منتشر معلومات الگ الگ بھی آئینوں کی طرح لو دیتی تھیں ۔ لیکن آئینہ خانے میں عکس در عکس کا جو طلسم پیدا ہوتا ہے الگ الگ آئینوں میں اسکا ظہور ممکن نہیں ۔ کسی نے درست کہا ہے کہ کُل اپنے اجزاء کے مجموعے سے کچھ زیادہ ہوتا ہے ۔

پھر سید صباح الدین صاحب کی یہ کوشش تــالیف محض بھی نہیں انھوں نے غالب شناسی اور غالب شکنی کی منتشر دستاویزات کی بہـم آوری اور تنسیق و ترتیب ھی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ جا بجا ذاتی محاکمہ شامل کر کے ,,تنقیدوں پر تنقید اور تبصروں پر تبصرہ،، بھـی فـرمایا ہے ۔ اس تبـصرہ و محــاکمہ سے اختلافِ رائے تو ممکن ہے لیکن اسکی اھمیت سے انکار ممکن نہیں ۔ بلکہ نگاہ غور سے دیکھیں تو یہ کتاب اختلافِ رائے ھی کا احترام سکھاتی ہے ۔ سید صاحب نے غالب کی مدح اور قدح دونوں کو پہلو بہ پہلو جگہ دے کر بین السطور اس احترام ھی کا سبق دیا ہے جو اختلافِ علمی کی آب و ھوا کو معتدل رکھنے کے لئے ضروری ہے اور اختلافِ ذاتی سے بہت بالاتر ہے ۔

رشید احمد صدیقی صاحب سے سید صباح الدین کی محبت انکی تحریر میں جا بجا جھلکتی ہے ۔ دونوں جلدوں کے دیباچے میں انھیں بطور خاص یاد کیا گیا ہے کہ انھی کی ذات اس کتاب کی تالیف کے سلسلے میں سب سے بڑا محرک تھی مگر وہ اپنی آنکھوں سے اسکی

تکمیل نہ دیکھ سکے ۔ تاہم بطور نقاد ان کی آراء پر بھی سید صاحب کا محاکمہ نہایت معروضی ہے ۔ چنانچہ فرماتے ہیں :

,,... رشید صاحب نے اس مضمون میں اپنی کچھ ایسی رائیں بھی ظاہر کی ہیں جن سے ان کی کیف و نشاط سے بھری ہوئی تحریروں کے بعض مداحوں کو اتفاق کرنے میں تامّل ہوگا،، (جلد دوم ص ۲۱۴)

اسکے بعد ان اختلافی آراء کی مثالیں دی ہیں اور ان پر بے لاگ تبصرہ کیا ہے ۔ محبت و احترام سے پُر، کچھ ایسا ہی اختلاف خود سید صاحب کی بعض آراء سے بھی کیا جا سکتا ہے ۔ مثلاً جلد اول میں صفحہ ۳۰ تا ۳۴ ,,اپنی مذمت آپ،، کے عنوان سے غالب کے جو اقتباسات مہیا کئے گئے ہیں ان سے ,,اپنی مذمت آپ،، کا استنباط کرنا محل نظر ہے ۔ یہ تحریریں تو ایک لطیف اسلوب میں ,,شکایتِ زمانہ،، پر مشتمل ہیں اور جو چیز بظاہر ,,خود مذمتی،، دکھائی دیتی ہے درحقیقت اسے ,,مدح بمایشبہ الذم،، کہنا زیادہ مناسب ہوگا ۔

اسی بحث میں ذرا آگے چل کر (ص ۳۹) ,,اپنی اردو شاعری کی تحقیر،، کا عنوان قائم کیا گیا ہے اور بطور استشہاد یہ دو شعر پیش کئے گئے ہیں جن سے یہ نتیجہ برآمد کرنے میں بہت سے قارئین کو تامّل ہو سکتا ہے :

ہمارے شعر ہیں اب صرف دل لگی کے اسد
کُھلا کہ فائدہ عرضِ ہنر میں خاک نہیں

ہم کہاں کے دانا تھے، کس ہنر میں یکتا تھے
بے سبب ہوا غالب دشمن آسماں اپنا

اسی طرح کا ایک استنباط یہ ہے :

,,وہ اپنی ناداری کو دور کرنے کے لئے دست سوال بھی دراز کر دیا

کرتے تھے جیسا کہ ان کے اس شعر سے ظاہر ہے :

بنا کے فقیروں کا ہم بھیس غالب
تماشائے اہل کرم دیکھتے ہیں،،
(جلد اول ص ۷۷)

اس سے ذرا پہلے (جلد اول ص ۷٦) غالب کے ,,چنا جان نہ سہی منا جان سہی،، والے خط کا کچھ حصہ جس سیاق و سباق میں نقل کیا گیا ہے خط کے پس منظر کو نظر میں رکھتے ہوئے یہاں اس کا اقتباس بھی محلّ نظر معلوم ہوتا ہے۔

تاہم یہ یا ایسی ہی چند اور مثالیں جنھیں زاویہ نگاہ کے اختلاف سے تعبیر کیا جا سکتا ہے سید صاحب کے ان خوبصورت ناقدانہ محاکمات کی اہمیت کو کسی طرح کم نہیں کر سکتیں جو جا بجا اس تالیف کے صفحات پر پھیلے ہوئے ہیں۔ مثلاً حالی کے مرثیہ غالب اور آب حیات میں محمد حسین آزاد کے قلم سے استاد ذوق کی مدح و توصیف کا موازنہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

,,حالی اور آزاد نے اپنے اپنے استاد کی مدح میں جو کچھ لکھا ہے ان دونوں میں مبالغے کا رنگ ضرور آ گیا ہے۔ لیکن دونوں میں فرق یہ ہے کہ آزاد نے اپنی نثر میں شاعری کی ہے اور حالی نے شاعری میں شاعری کی ہے۔ شاعری کے لئے مبالغہ بعض اوقات تو حسن اور زیور بن جاتا ہے لیکن یہ بات کسی بھی نثر کے لئے نہیں کہی جا سکتی،، (جلد اول ص ۷۳)

غالب اور آزاد کے محاکمے میں سید صاحب کا یہ کلامِ منصفانہ بھی اہمیت کا حامل ہے کہ :

,,آزاد نے اپنے استاد کی جو مدح سرائی کی ہے اس سے غالب کے پرستار خواہ کتنے ہی آرزدہ ہوں لیکن اس حقیقت سے بھی کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ غالب کی شخصیت اور ان کی

شاعری کے روشن پہلوؤں کو باضابطہ تحریر میں لانے کی اوّلیت آزاد ہی کو حاصل ہے۔ (جلد اول ص ٦۳) .

اسی طرح حالی کی ,,یاد گار غالب،، کے سلسلے میں یہ اہم نکتہ :

,,.... اس میں حالی کے دل نشین طرز ادا کو بھی بڑا دخل ہے۔ انھوں نے اپنے قلم کے آرٹ سے غالب کی کمزوریوں کی طرف پڑھنے والے کا ذھن تو ضرور متوجہ کر دیا لیکن ان کی کمزوریوں سے متاثر نہیں ہونے دیا ... ،، (جلد اول ص ۷۹)

انگریزوں کی خوشامد کا طعن جو غالب پر اکثر کیا جاتا ہے اس کے جواب میں سید صاحب کا یہ تبصرہ کس قدر حقیقت پسندانہ ہے :

,,اور پھر غالب کیا پورا ھندوستان انگریزوں کے سیاسی چوگان کا گیند بن گیا ۔ انگریزوں کے دربار کے ایک گیند بننے کی شکایت غالب سے ہے تو پورے ھندوستان سے بھی ہونا چاھئے اور اگر ھندوستان سے نہیں ہے تو پھر خستہ جان، پریشان حال، مقروض، آشفتہ نوا، ستم ھائے روزگار کو برداشت کرنے والے اور زمانے کے مارے ہوئے اسد اللہ خاں غالب سے بھی نہیں ہونا چاھئے ۔ اس وقت کا ھندوستان اپنی زبان حال سے غالب کے لئے یہی کہہ رہا تھا ع

غالب کو برا کیوں کہو اچھا مرے آگے

(جلد اول، ص ۱۸۱)

جلد دوم میں آل احمد سرور صاحب کے اسلوب تنقید پر (ص ۱۸۴، ۱۸۵، ۱۸۷، ۱۸۹) اور سید احتشام حسین صاحب کے اشتراکی تخیل پر (ص ۲۰٦) تبصرہ بھی بھر پور اور کاٹ دار ہے۔

ھر چند سید صاحب نے کتاب کی حدود متعین کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ ,,.... ہم غالب کی اردو شاعری کی مدح و قدح پر زیادہ

زور دینا چاهتے هیں ۔ ان کی فارسی شاعری اور نثر پر صرف سرسری جائزہ لینے پر اکتفاء کرتے هیں،، (جلد اول ص ۹۱) تاهم اس کتاب میں جسو مباحث سرسری طور پر آئے هیں وہ بھی خاصے جامع هیں ۔ غالب سے متعلق مختلف موضوعات پر بہت سی طویل کتابوں کا نچوڑ جا بجا نہایت اختصار کے ساتھ جمع کر دیا گیا ہے اور ساتھ ساتھ صفحات کے حوالے بھی قوسین میں مہیا کر دیئے گئے هیں ۔ مثال کے طور پر جلد اول ص ۲۱۱ ۔ ۲۱۲ پر ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری کے مشہور مقالے کی تلخیص ۔ اسی طرح ص ۱۵۱ ۔ ۱۵۲ پر غالب کے رنگ تغزل کا تجزیہ کرتے هوئے اس کے کلام سے ان کلیدی الفاظ و تراکیب کا انتخاب جو اس کے هاں تصورات کی بو قلمونی و گونا گونی کو ظاهر کرتے هیں ۔ یا جلد دوم میں صفحہ ۱۲۴ و مابعد پر مولانا عرشی رام پوری کی کتاب ,,سرگزشت غالب،، کا اور صفحہ ۲۹۵ پر ڈاکٹر سید عبداللہ کے مضمون کا خلاصہ ۔ یا اسی جلد میں صفحہ ۱۳۰ ۔ ۱۳۱ پر عرشی صاحب کے اور صفحہ ۱۴۱ پر ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کے حوالے سے غالب کے املاء اور رموز و اوقاف کا جائزہ ۔ اس ضمن میں جلد دوم صفحہ ۷۰ تا ۸۸ پر غالب کے سوانح زندگی کا خلاصہ باعتبار سنین جو مختلف مصادر سے بہم پہنچایا گیا ہے نیز صفحہ ۱۵٦ و مابعد پر دیوان غالب کی مختلف اشاعتوں سے متعلق معلومات بھی مؤلّف کی عرق ریزی کا پتہ دیتی هیں ۔ بعض مضامین شعری کے سلسلے میں غالب کے حوالے سے دیگر اساتذہ کے کلام کا ایک انتخاب جا بجا پیش کیا گیا ہے جو متفرق دواوین کے بالاستیعاب مطالعے کے بغیر ممکن نہ تھا (مثال کے طور پر دیکھئے جلد اول، ص ۱۴۱ تا ۱۴۳، ۱۴٦، ۱۴۷) ۔ غالب کے بیسیوں اشعار کی تشریح اور اس ضمن میں مختلف شارحین کے ارشادات کا موازنہ بھی وسیع مطالعے کا نچوڑ پیش کرتا ہے ۔

جلد دوم صفحہ ۱۴۴ پر مالک رام کی سابقہ ذوق پرستی، صفحہ ۲۵۷ پر نثار علی شہرت کی روایت بسلسلہ ملاقاتِ غالب ـــ (جس کی تفصیلات پر فی الفور یقین کرنے میں شاید بہت سے قارئین کو تامّل ہو) ـــ اور صفحہ ۲۶۱ ، ۲۶۲ پر ملک الشعراء بہار کی رائے، ایسے نادر نکات پر مشتمل ہیں جو آسانی سے ہاتھ نہیں آتے ۔

سید صاحب کی ایک قابل ذکر رائے جس کا اظہار انھوں نے اس کتاب میں بار بار کیا ہے یہ ہے کہ غالب کی عظمت ان کے منتخب مطبوعہ کلام ہی پر قائم ہے۔ ان کا رد کیا ہوا غیر مطبوعہ کلام ڈھونڈ ڈھانڈ کر شائع کرنا ان کے نزدیک ایک نامناسب رویہ ہے فرماتے ہیں :

,,یہ عجیب ستم ظریفی ہے کہ میر کا سارا کلام چھپ کر سامنے آیا تو اب ان کا انتخاب شائع کیا جا رہا ہے لیکن غالب نے اپنا منتخب کلام پیش کیا تو ان کے سارے کلام کی جستجو جاری ہے،، (جلد اول ص ۱۸۷)

,,... لیکن آئندہ ان کے پراگندہ، مغلق، مشکل، اور نظری کلام کو اکٹھا کر کے ان کا کوئی ضخیم دیوان لوگوں کے سامنے پیش ہوا اور اسکے مطالعے پر اصرار کیا گیا تو بہت ممکن ہے کہ غالب کی وہ مقبولیت باقی نہ رہے جو آج ان کو حاصل ہے،، (جلد دوم ص ۲۹۹)

الغرض سید صباح الدین عبدالرحمن کی یہ تالیف اپنے حجم سے کہیں زیادہ متنوع معلومات کا ذخیرہ اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے اور غالبیات کے کتب خانے میں ایک گراں قدر اضافہ ہے۔ سید صاحب نے اس میں غالب کے حوالے سے ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری جیسے پرجوش مادحین اور یگانہ، آرگس ، اور ڈاکٹر عبداللطیف جیسے قادحین کو یکساں فراخ دلی کے ساتھ پہلو بہ پہلو جگہ دی ہے ـــ (غالب کے ہم عصر میر محمد خاں سرور سے لے کر ڈاکٹر عبادت

بریلوی تک تقریباً ۷۵ شخصیات کی دور بدور مدح و قدح زیر بحث لائی گئی ہے) ـــ اور خود ایک منصف مزاج ناقد کی طرح دونوں پر بے لاگ نقد و تبصرہ کیا ہے اور ہر ایک کو اس کا حق دینے کی کوشش کی ہے ۔ چنانچہ ڈاکٹر عبداللطیف کی غالب شکن آراء کا تجزیہ کرتے ہوئے جہاں ان پر تنقید کی ہے وہاں غالبیات کے میدان میں ان کی ایک خاص عطا کا ذکر بھی ضروری سمجھا ہے :

,,... البتہ ڈاکٹر عبداللطیف نے اپنی کتاب میں دو ایسی نئی باتوں کی طرف متوجہ کیا جن کی طرف غالب کے سوانح نگاروں اور نقادوں کا ذہن منتقل نہیں ہوا تھا ۔ ایک تو یہ کہ ان کی زندگی کے واقعات تاریخ وار اور ترقی وار بیان کئے جائیں دوسری یہ کہ ان کے کلام کی ترتیب بھی سنین وار دی جائے تاکہ ان کے ذہن و کمال کے نشوونما اور ارتقاء پر روشنی پڑے ۔ اور یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ ڈاکٹر صاحب کی یہ دونوں باتیں غالبیات کے حلقہ میں سنی گئیں،، (جلد اول ص ۳۳۹)

دوسری جلد کے آخر میں صفحہ ۳۸۷ تا ۳۹۷ ایک تتمہ لکھا ہے جس میں پوری کتاب کے مباحث کی ایک مختصر باز گشت پیش کی ہے ۔ کتاب میں اغلاط کتابت جن پر دونوں جلدوں کے دیباچے میں مولّف نے اظہارِ تاسّف کیا ہے واقعی افسوسناک حد تک کثرت سے پائی جاتی ہیں ۔ ایک اور کمی یہ محسوس ہوتی ہے کہ ہر چند مختلف مباحث کے دوران قوسین میں مآخذ کے صفحات کے حوالے دے دیئے گئے ہیں لیکن آخر کتاب میں کوئی مرتب ,,فہرست مآخذ،، مہیا نہیں کی گئی جس سے یہ تمام مآخذ بیک نگاہ سامنے آ سکیں نیز یہ معلوم ہو سکے کہ مولّف کے استعمال میں ان کے کون سے ایڈیشن رہے تھے ۔ لیکن یہ کمی ایسی نہیں جس کے لئے ایک معروف صاحب قلم لازماً خود ہی اپنا قیمتی وقت صرف کرے ۔ یہ کام مولّف مرحوم کے تلامذہ بخوبی انجام دے سکتے ہیں ۔

●●●

بزم صوفیه

محمد میاں صدیقی

برصغیر پاک و ھند میں اسلام کے حوصلہ مند دستے پہلی صدی ہجری کے اختتام سے قبل آنا شروع ھوگئے تھے ۔ ۹۳ ہجری میں محمد بن قاسم ثقفی (م : ۹٦ ھ) نے سندھ بلکہ ملتان تک کا علاقہ فتح کر لیا تھا اور باقاعدہ اسلامی حکومت کا قیام عمل میں آگیا تھا۔

برصغیر میں مسلمانوں کی آمد کے ساتھ ھی تبلیغ دین کا سلسلہ شروع ھوگیا تھا ۔ محمد بن قاسم نے کشور کشائی کی به نسبت تبلیغ دین کو زیادہ اهمیت دی، اور دیبل فتح کرنے کے بعد وهاں چار ہزار مسلمان آباد کئے اور ایک جامع مسجد تعمیر کرائی ۔ (۱)

اموی خـاندان نے سندھ پر خصوصی توجه دی، خصوصاً حضرت عمر بن عبدالعزیز (م : ۱۰۱ھ) کو تبلیغ دین کا بہت زیادہ خیال تھا۔ انھوں نے سندھ کے چیدہ چیدہ امراء اور سربـر آوردہ لوگوں کو خطوط کے ذریعے اسلام کی دعوت دی، انھی کی دعوت کے نتیجے میں راجه داھر کا بیٹا جے سنگھ مشرف باسلام ھوا ۔ اس کے علاوہ بہت سے بااثر اور مقتدر لوگوں نے اسلام قبول کیا ۔ (۲)

اموی دور میں سندھ میں جو مسجدیں تعمیر کی گئیں وهاں جید علماء کو بطور امام اور خطیب مقرر کیا گیا، ان علماء کی شبانه روز مساعی سے اسلام کی روشنی دور دور تک پھیلی ۔ برصغیـر میـں مسلمان جہاں بھی گئے انھوں نے تبلیغ دین کو اپنا اولیـن فریضـه

سمجھا، مسلمان تاجروں کی محنت سے گجرات، مارواڑ، مدراس اور جنوبی ہند کے دوسرے ساحلی علاقوں میں اسلام کا اثر و نفوذ بڑھا۔

دوسری صدی ہجری ہی میں برصغیر میں جگہ جگہ داعیان اسلام کے مرکز اور خانقاہیں قائم ہونا شروع ہوگئیں جو بیاباں کی شب تاریک میں قندیل رہ نمائی کی طرح جگمگانے لگیں۔ بجا کہ اسلام کی ترویج و اشاعت میں مسلمان فاتحین، تجار اور علماء سب نے حصہ لیا لیکن تاریخ ہند کا مطالعہ کرنے والے یہ کہنے پر مجبور ہوئے کہ جس طرح ہندوستان کی علاقائی فتح کا سہرا سلطان محمود غزنوی (م:۴۲۱ھ) کے سر ہے اسی طرح اس کی روحانی تسخیر اور اخلاقی و ایمانی فتح کا سہرا مشائخ اور صوفیۂ کرام کے سر ہے۔ برصغیر میں تبلیغ دین کے سلسلے میں جو کامیابی و کامرانی بزرگان دین کو نصیب ہوئی وہ کسی اور کا حصہ نہ بن سکی۔

قرآن کریم نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عملی زندگی کو، آپ کے اخلاق فاضلہ کونسل انسانی کے لئے نمونہ کامل بنایا ہے۔ اس کی پیروی کا حکم دیا ہے۔ خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے : بعثت لاتمم مکارم الاخلاق(۳) ,, میری بعثت کی غایت ہی یہ ہے کہ میں بہترین اخلاق کی تکمیل کروں،، یہی وجہ ہے کہ صوفیۂ کرام نے سلوک کو تمام تر مکارم اخلاق پر موقوف کیا ہے۔ بلکہ بعض مشائخ نے تو تصوف سے اخلاق حسنہ ہی مراد لئے ہیں۔

صوفیہ کے نزدیک تصوف کا مقصد صرف یہ ہے کہ پہلے انسان خود اپنے اندر اخلاق حسنہ پیدا کرے، پھر دوسرے افراد میں اس کی تخم ریزی کرے۔ چنانچہ خواجہ نظام الدین اولیاء رحمة اللہ علیہ فرماتے ہیں :

,,بہت نمازیں پڑھنا، وظائف میں بکثرت مشغول رہنا، تلاوت قرآن میں مصروف رہنا۔ یہ سب کام چنداں مشکل نہیں ہیں، ہر

باهمت شخص کر سکتا ہے بلکہ ایک ضعیف بڑھیا کے لئے بھی ممکن ہے وہ روزوں پر مداومت کر سکتی ہے تہجد ادا کر سکتی ہے ، قرآن کے چند پارے ہر روز پڑھ سکتی ہے لیکن مردان خدا کے کام کاج میں لگے رہنا کچھ اور ہی معنی رکھتا ہے (۴) ۔

ایمان کے بعد اسلام کی عمارت چار ستونوں پر قائم کی گئی ہے یعنی نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج ۔ ان چاروں کا بنیادی مقصد بھی قرآن جگہ جگہ یہی بتاتا ہے کہ انسان ایک پاکیزہ انسان کے قالب میں ڈھل جائے ۔ اور محاسن اخلاق کی بے داغ تصویر ہو ۔ اس حقیقت کو قرآن ,,لعلکم تتقون،، سے تعبیر کرتا ہے ۔ حضور علیہ السلام نے بہترین اخلاق کو قدرت کا سب سے اعلیٰ اور گراں قدر عطیہ فرمایا ہے (۵) ۔

صوفیہ اور اولیاء بھی نبی علیہ السلام کے اخلاق حسنہ کا عکس اور پرتو ہوتے ہیں اس لئے زیادہ ضرورت اس بات کی ہے کہ صوفیہ نے زندگی میں عمل کا جو نمونہ پیش کیا ہے لوگ اسے اپنائیں ۔ اور حقیقت میں ہوا بھی ایسا ہی ہے ۔ صوفیۂ کرام نے کتابیں نہیں لکھیں، مناظرے نہیں کئے، بحث و تمحیص میں نہیں پڑے ۔ صرف لوگوں کے سامنے نمونۂ عمل پیش کیا ۔ لوگ ان کی خانقاہوں اور مسجدوں میں آتے ۔ وہ کسی سے اس کا عقیدہ اور مسلک نہیں پوچھتے تھے ۔ برصغیر کے صوفیہ کی تاریخ تو ہمیں یہاں تک بتاتی ہے کہ وہ یہ بھی شرط نہیں لگاتے تھے کہ مسلمان بھی ہو یا نہیں ۔ بعض غیر مسلم آتے وہ انہیں بھی اپنے حلقہ بیعت میں شامل کر لیتے ۔ ان کے پیش نظر یہ بات ہوتی تھی کہ یہ شخص جب کچھ روز ہمارے ساتھ گزارے گا، ہمیں اور ہمارے حلقے کے لوگوں کے معاملات اور معمولات دیکھے گا تو اس میں خود اسلام کی طرف کشش ہوگی ۔ نہ اسے کتابیں پڑھوانے کی ضرورت پیش آئے گی اور نہ کچھ کہنے سننے کی ۔

اس موقعہ پر یہ عرض کرنے کی اجازت چاہوں گا کہ علماء نے قرآن اور حدیث کی تفسیر و توضیح میں اپنی عمریں صرف کیں، امت کے لئے گراں قدر سرمایہ فراہم کیا، اور اس طرح عقل اور دماغ کی آبیاری کی ۔ لیکن یہ کہے بغیر چارہ نہیں کہ صوفیہ نے دماغ کے ساتھ دل کی تربیت اور اصلاح کا فرض بھی حسن و خوبی کے ساتھ انجام دیا،

علماء نے کتابیں لکھیں، اور صوفیہ نے وہ افراد تیار کئے جنھوں نے ان کتابوں پر عمل کر کے ایک انقلاب برپا کر دیا ۔

جب ذات و صفاتِ باری تعالیٰ کے متعلق بحث و مناظرہ کی گرم بازاری ہوئی، اس وقت بھی صوفیہ نے یہی کہا اور یہی درس دیا کہ: اللہ کے بارے میں بحث و مناظرہ فضول ہے ۔ اللہ کو منطق کے زور سے حاصل نہیں کیا جا سکتا ۔ آئینہ قلب کو صاف کر لو اس کے جلوے خود نظر آنے لگیں گے ۔

حقیقت ایک اور صرف ایک ہے ۔ اور وہ یہ کہ دنیا میں سب سے موثر آلۂ کشش نمونہ عمل ہے ۔ کتابوں کے اوراق اور ان کے بے جان حروف کو متحرک اور سرگرم عمل حقیقتوں پر غالب آتے بہت کم دیکھا گیا ہے ۔ یہی وجہ تھی کہ بالخصوص برصغیر پاک و ہند میں اسلام کی تبلیغ و اشاعت کا سب سے بڑا ذریعہ صوفیۂ کرام ہی بنے ۔

یہی وہ محرک تھا جس نے برصغیر کے معروف صاحب قلم اور تاریخ داں جناب صباح الدین عبدالرحمن کو برصغیر کے صوفیہ کا تذکرہ لکھنے پر آمادہ کیا ۔ بقول مولانا عبدالماجد دریابادی :

,,ذاتی سرگزشتوں کی داستان کسی کی بھی ہو، دلچسپ ہوتی ہے ۔ چہ جائے کہ ان بزرگوں کی سرگزشت جو انسانیت کے پتلے، تسلیم و رضا کے بندے، اور محبت و محبوبیت کے مجسمے تھے ۔

دل آویزی ان کے تذکروں میں بھی نہ ہوگی تو اور کہاں ملے گی۔
ان الـذین آمـنوا وعملوا الصالحات سیجعل لهم الرحمن ودا ۔
اور پھر جبکہ داستان گو خود داستان سرائی سے واقف ، اور
اس فن میں منجھا ہوا ہو،، (٦) ۔

سید صباح الدین عبدالرحمن نے ,,بزم صوفیہ،، لکھنے کی جو غرض و غایت بیان کی اس کی ابتداء (تمہید میں) ان الفاظ سے کرتے ہیں :

,,صحابہ کرام ، تابعین اور تبع تابعین کی طرح صلحاء اور اخیار امت کی زندگی بھی مسلمانوں کے لئے نمونہ ہے اس لئے دارالمصنفین کے سلسلہ سیر الصحابہ اور تابعین کے بعد سیرت صوفیہ کی بھی ضرورت تھی، یہ کتاب اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ راقم سطور تاریخ ہند کا ادنی طالب علم ہے اس لئے اس کتاب کی ترتیب میں یہ بھی مـطالعہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ خانقاہ کے بوریہ نشینوں نے اپنے عہد کے مسلمانوں کے مذہب، اخلاق، معاشرت اور سیاست کو کس طرح سنوارا ۔ تاریخ ہند کے مطالعہ میں عموماً مسلمان حکمرانوں کے افعال و کردار سے اس زمانہ کے مسلمانوں کے اخلاق اور سیرت و کردار کا اندازہ لگایا جاتا ہے جو صحیح نہیں ہے۔ ہندوستان میں صلحاء اور مشائخ ہی نے اسلام کی معنوی شوکت و عظمت قائم کی ۔ اس لئے ان کے حالات و تعلیمات کو ہندوستان کے اسلامی عہد کی تاریخ سمجھنا چاہیے،، (٧) ۔

بزم صوفیہ کا زمانۂ تالیف چودھویں صدی ہجری کا نصف آخر ہے اور ظاہر ہے کہ برصغیر کے صوفیہ اور مشائخ کے حوالہ سے اس سے قبل فارسی اور اردو میں بہت کچھ لکھا جا چکا تھا ۔ یہ کہنا تو ممکن نہیں کہ بزم صوفیہ اس موضوع پر لکھی جانے والی ابتدائی

کتابوں میں شامل ہے۔ پھر یہ سوال ابھرتا ہے کہ صوفیہ ، تصوف اور سلاسل تصوف پر جب کافی کچھ لکھا جاچکا تھا اور بعض بہت مستند اہل علم و فضل اس موضوع پر ضخیم کتابیں تالیف کر چکے تھے پھر صباح الدین عبدالرحمن نے اس موضوع پر قلم اٹھانے کی ضرورت کیوں محسوس کی ۔ ؟

اس کا جواب مولف بزم صوفیہ ان الفاظ میں دیتے ہیں :

,,اب تک صوفیۂ کرام کے جتنے تذکرے لکھے گئے ہیں ان میں زیادہ تر ان کی کرامات و خوارق عادات کی تفصیل بیان کی گئی ہے ۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان بزرگان دین کی اصلی تصویر نظروں سے بالکل اوجھل رہی ۔ ممکن ہے کہ اس حقیر تالیف میں ناظرین کو ہندوستان کے مشائخ کی کچھ ایسی تصویریں ملیں جو اور تذکروں میں شاید نہ مل سکیں " (۸) ۔

فاضل مولف نے اپنے سلف کے طرز تالیف سے کیوں گریز کیا ۔ اور صوفیہ کے ان کشف و کرامات کا ذکر اپنی کتاب میں کیوں نہیں کیا جن کا شیخ عبدالحق دھلوی جیسے محدث کبیر تک نے اپنی تالیف اخبار الاخیار میں کیا ہے ۔ ؟

کشف، الہام اور کرامات صوفیہ کی زندگی کا ایک لازمی حصہ ہیں، اہلِ سنت والجماعت کا عقیدہ ہے کہ اللہ کے نیک بندوں کو کشف و الہام بھی ہوتا ہے اور ان کی ذات سے بعض ایسے امور بھی وقوع پذیر ہوتے ہیں جو عام طور پر عادتاً نہیں ہوتے اور جنھیں علم کلام کی اصطلاح میں ,,خارق عادات،، کہا جاتا ہے ۔

مسلم علماء اور خاص طور پر متکلمین نے کشف، الہام اور وحی کی حقیقت اور ان کے باھمی فرق پر طویل بحثیں کی ہیں ۔ نبی کی ذات سے جو بات معمول اور عادت کے خلاف (خرق عادت) صادر ہو اسے معجزہ سے تعبیر کیا جاتا ہے اور نبی کے علاوہ ایک عام انسان کی

ذات سے کوئی چیز خلاف عادت صادر ہو تو وہ کرامت کہلاتی ہے (۹) ۔

اس حقیقت کے باوجود مولف بزم صوفیہ نے صوفیہ کے تذکرے میں ان کی ذات اور نفوس قدسیہ سے وابستہ کشف و کرامات کے ذکر سے کیوں گریز کیا ۔ ؟

اس کی بنیادی وجہ کیا ہے ۔ اس کی وضاحت یوں کرتے ہیں :

,,اس کتاب میں صوفیۂ کرام کے کرامات و خوارق عادات کا ذکر اس لئے نہیں کیا گیا ہے کہ راقم ان کا قائل نہیں ہے ۔ بلکہ اس لئے کہ جس طرح بعض لوگوں کے نزدیک ایک معجزہ نبوت کی دلیل نہیں اسی طرح کرامت بھی ولایت کا ثبوت نہیں ۔ خود اولیاء اللہ اپنی کرامتوں کو اپنا شرف اور کمال نہیں سمجھتے ۔ اس لئے ان کو اوصاف میں شمار کرنا ضروری نہیں سمجھا گیا،، (۱۰) ۔

مولف کی اپنی مذکورہ بالا بیان کردہ وجہ کے علاوہ یہ وجہ بھی ہو سکتی ہے کہ کشف اور کرامت کا عام انسان کی عملی زندگی سے براہ راست کوئی تعلق نہیں ہے کسی خاص انسان کی زندگی کو عام لوگوں کے سامنے پیش کرنے کا اصل مقصد یہ ہوتا ہے ، اور یہی ہونا چاہیے کہ لوگ اس کے بہترین اور پاکیزہ اخلاق سے متاثر ہوں اور انہیں اپنی عملی زندگی میں اپنانے کی کوشش کریں ۔

خود بزرگان دین نے کبھی اس بات کو پسند نہیں کیا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو کشف و کرامت کی جس نعمت سے نوازا ہے وہ خود یا دوسرے لوگ اس کی تشہیر کریں ۔ حضرت بابا فرید الدین گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ (م : ۶۶۴ھ) فرمایا کرتے تھے :

,,اس کا اظہار کرنا پست حوصلہ والوں کا کام ہے مشائخ نے اس کے اظہار کو ناپسند کیا ہے ۔ کیوں کہ اس سے نفس میں تکبر پیدا ہوتا ہے،، (۱۱) ۔

صاحب بزم صوفیہ نے بھی حضرت بابا فرید کا یہ قول درج کیا ہے۔

بزم صوفیہ نام رکھنے کی وجہ :

اگرچہ صوفیہ کے بارے میں لکھی جانے والی کتابوں کے ناموں میں بھی تنوع ہے۔ اور ایک خوبی یہ ہے جو ناچیز راقم نے محسوس کی کہ کتاب کا نام اور عنوان معنون کا غماز ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ جو کتابیں ان کی تعلیمات اور ملفوظات پر مشتمل ہیں ان کے ناموں کا انداز مختلف ہے۔ جن کا تعلق صرف سیرۃ و سوانح سے ہے ان کے ناموں کا انداز اور ہے۔ زیر تبصرہ کتاب کا نام (جو کہ مشاہیر صوفیہ کے احوال و آثار پر مشتمل ہے) روایتی اسلوب اور انداز سے ہٹ کر کیوں رکھا گیا۔ ؟ اس کی وجہ اور وضاحت خود فاضل مصنف کی زبانی سنئے۔ کہتے ہیں کہ :

> ,,کتاب کا نام،، بزم صوفیہ،، بھی شاید بعض ناظرین (وقارئین) کو اس لئے پسند نہ آئے کہ صوفیہ کے لئے بزم کا لفظ بے جوڑ سا ہے لیکن یہ نام راقم کو اتنا پسند آیا کہ کسی اور نام کی طرف طبیعت مائل ہی نہ ہوئی ،،(۱۲) ۔

ہر مسلمان کے دل میں حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت و عقیدت جلوہ گر ہوتی ہے۔ خصوصاً ان لوگوں کے دل سب سے زیادہ منور اور تابناک ہوتے ہیں جن کی زبان اور قلم پر ہر وقت حضور اقدس اور ان کے شیدائیوں کا تذکرہ رہتا ہے۔

کچھ ایسا ہی حال ہم بزم صوفیہ کے مصنف صباح الدین عبدالرحمن کا بھی دیکھتے ہیں ۔ وہ ایسے پاک طینت لوگوں کے حالات لکھنے کے لئے قلم اٹھا رہے ہیں جن کے دلوں میں اللہ کی، اور اس کے رسول کی محبت کے سوا اور کسی چیز کی گنجائش نہیں ہوتی وہی عکس اور پرتو صباح الدین کے قلم اور لوح قلب پر منعکس ہوتا ہے۔ کہتے ہیں کہ :

,,مشائخ کے حالات کے سلسلہ میں تعظیم و تکریم کے لئے ,,آپ،، کا لفظ گویا بالکل ھی استعمال نہیں کیا ۔ اس کی اگر کوئی خاص وجہ ھو سکتی ہے تو صرف یہ کہ کسی موقع پر حضرت الاستاذ مولانا سید سلیمان ندوی (م : ۱۹۵۳ء) نے میری ایک تحریر دیکھتے ھوئے فرمایا تھا کہ: میں تو لکھتے وقت ,,آپ،، کا لفظ صرف آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم ھی کے لئے استعمال کرنا پسند کرتا ھوں،، ۔ یہ بات میرے دل میں اس قدر لگی کہ ان بزرگوں کے لئے ,,آپ،، کا لفظ استعمال کرنا مناسب معلوم نہ ھوا، اور زیادہ ان کے اسمائے گرامی ھی لکھے گئے۔ یا ,, وہ ،، اور انھوں، سے اشارہ کیا گیا ہے۔ یہ طریقہ جن ناظرین کے ذوق پر گراں گزرے، ان سے معذرت خواہ ھوں ،، (۱۳) ۔

میرا خیال ہے کہ جو شخص محبت اور عقیدت و احترام کی باریکیوں، اور ان کے آداب سے واقف ہے اسے یہ اسلوب ، اور پیرایۂ اظہار ناگوار تو کیا گزرے گا وہ مصنف کے اس جذبہ دل کی داد دیئے بغیر نہیں رھے گا کہ اس نے حضور میں، اور حضور کے شیدائیوں میں کیسا خوب صورت اور باریک خط امتیاز کھینچا ہے ۔ ★

صوفیہ کے سوانح، اور احوال و آثار پر مبنی ایک کتاب کا تعارف پیش نظر ہے تو یہ وضاحت بے محل نہ ھوگی کہ اولیائے کرام کے

★★ اسی طرح کی ایک اصطلاح ,,روضۂ اقدس،، اور ,,آں حضرت،، بھی ہے ۔ میں نے بعض حضرات کو دیکھا ہے کہ وہ فرط عقیدت سے یہ اصطلاحات اپنے اساتذہ، شیوخ، اور پیروں کے لئے بھی استعمال کر لیتے ھیں ۔ لیکن ناچیز راقم کسی بزرگ ترھستی کے لئے بھی آں حضرت کا لفظ (بجز حضور انور کے) اور اسی طرح کسی کے مزار کے لئے روضۂ اقدس کی تعبیر مناسب نہیں سمجھتا ۔

ایک اور لفظ ہے ,,والدۂ ماجدہ،، ۔ اس کے بارے میں بھی میں نے کثرت سے دیکھا کہ مولفین و مصنفین اپنے اساتذہ، شیوخ اور پیروں کی والدہ کے لئے والـدہ ماجدہ کی تعبیر اختیار کرتے ھیں ۔ میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی والدہ محترمہ کے علاوہ کسی بڑی سے بڑی شخصیت کی والدہ کے لئے بھی کبھی یہ لفظ استعمال نہیں کیا، نہ جانے کیوں طبیعت پر گراں گزرتا ہے۔ دوسرے بہت سے حضرات کے لئے دل میں تمام تر احترام، اور جذبہ محبت کے باوجود دل نہیں مانتا کہ اولاً جو لفظ، اور جو اصطلاح حضور انور کے لئے، ان کے والدین کے لئے، اور ان کی ازواج و اولاد کے لئے استعمال کی گئی وہ ان کے علاوہ کسی اور کے لئے استعمال کی جائے ۔

حالات میں عام طور پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں اس حزم و احتیاط کو ملحوظ نہیں رکھا گیا جو ہمیں فقہاء اور محدثین کی کتابوں میں نظر آتا ہے۔ اس کی جہاں اور بہت سی وجوہ ہیں وہاں ایک وجہ یہ بھی ہے کہ حضرات صوفیہ مختلف احوال و مقامات سے گزرتے رہتے ہیں، ان کے سیر و سلوک کی بہت سی منزلیں عوام، اور اہل ظاہر کے لئے ناقابل فہم ہوتی ہیں ۔ اور اس پر طرہ ۔ ان کی خاص اصطلاحات، اور رمزوکنایے ۔ لفظ بولا کچھ گیا اور مراد اس سے کچھ لے لیا ۔ اور پھر حالات اور ملفوظات قلم بند کرنے والوں کا محبت و عقیدت میں غلو۔ بات کو کہیں سے کہیں پہنچا دیتا ہے۔

صوفیہ کے حالات پر مشتمل ایک معروف کتاب ,,سیر العارفین،، نے اس بات کی نشان دھی کی ہے :

,, ایک شخص نے حضرت نصیر الدین اَوَدھی سے عرض کیا کہ میں نے خواجہ قطب الحق والدین قدس سرہ کے ملفوظات میں ایسا کچھ لکھا ہوا دیکھا ہے۔ آپ نے جواب میں فرمایا کہ، بالکل غلط ہے۔ میں نے بہ چشم خود دیکھا ہے کہ ۔ماشاء اللہ، یہ کلام ان کا نہیں ہے۔ اکثر غلط غلط کلمات الحاقی ہیں جو ان کے مجاوروں اور سجادہ نشینوں نے بڑھا دیئے ہیں وہ کسی طرح قطب صاحب قدس سرہ، کے حال، اور اعمال کے مناسب نہیں ہیں ،،(۱۴)۔

بہرکیف اس تمام تر کے باوجود فاضل مصنف کو ملفوظات و مکتوبات کے انبار عظیم میں اخذ و نقل کے قابل جو کچھ نظر آیا اسے حسن ترتیب، اور سلیقہ مندی کے ساتھ جمع کر دیا ۔ اور مولانا عبدالماجد دریا بادی کے بقول: احتیاط اپنے نزدیک اس کی کرلی کہ جو امور خلاف شریعت، یا بہت زیادہ مبالغہ آمیز نظر آئیں انہیں نظر انداز کر دیا جائے،، ۔ لیکن مولانا ہی کا کہنا ہے کہ اتنی احتیاط بھی

ناکافی رہی، کتاب میں کئی مقامات ایسے آتے ہیں جہاں پہنچ کر ایک سیدھا سادا پابند شریعت چونک جاتا ہے لیکن اس میں قصور مصنف کا نہیں، ماخذوں کا ہے۔

تذکرے کے لئے برصغیر سے تعلق رکھنے والی صرف انیس شخصیتوں کو منتخب کیا گیا ہے۔ میرے نزدیک اس کا کوئی موزوں جواب نہیں دیا جا سکتا، جتنی بھی شخصیات کا انتخاب کرتے یہی کہا جاتا کہ سینکڑوں شخصیات میں سے ان حضرات کا انتخاب کیوں کیا گیا ۔ انتخاب تو کرنا ھی تھا، انیس کا کر لیا ۔ جو شخصیات منتخب کیں وہ اپنے رتبے، اور خدمت اسلام کے لئے بلاشبہ بہت بلند مقام رکھتی ھیں ۔

ان حضرات کی ترتیب کچھ اس طرح ہے :

۱ : پیر سید علی ھجویری ۔ معروف داتا گنج بخش ۔ (م : ۴۶۵ھ)
۲ : خواجہ معین الدین چشتی ۔ (م : ۶۳۲ھ)
۳ : خواجہ قطب الدین بختیار کاکی ۔ (م : ۶۳۴ ھ)
۴ : قاضی حمید الدین ناگوری ۔ (م : ۶۴۱ھ)
۵ : شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی ۔ (م : ۶۶۱ھ)
۶ : شیخ صدر الدین عارف ۔ (م : ۶۸۴ھ)
۷ : خواجہ فرید الدین گنج شکر ۔ (م : ۶۶۴ھ)
۸ : شیخ فخر الدین عراقی ۔ (م : ۶۸۸ھ)
۹ : شیخ امیر حسینی ۔ (م : ۷۱۹ ھ)
۱۰ : خواجہ نظام الدین اولیاء ۔ (م : ۷۲۵ھ)
۱۱ : شیخ بو علی قلندر پانی پتی ۔ (م : ۷۲۴ھ)
۱۲ : شیخ ابو الفتح رکن الدین ۔ (م : ۷۳۵ھ)
۱۳ : شیخ برھان الدین غریب ۔ (م : ۷۳۸ ھ)

۱۴ : مولانا ضیاء الدین نخشبی ۔ (م : ۷۵۱ ھ۔)
۱۵ : خواجه نصیر الدین محمود چراغ دهلی ۔ (م : ۷۵۷ھ۔)
۱٦ : شرف الدین احمد منیری ۔ (م : ۷۸۲ھ۔)
۱۷ : سید جلال الدین بخاری ۔ (م : ۷۸۵ھ۔)
۱۸ : سید اشرف جهاں گیرسمنانی ۔ (م : ۸۰۸ھ۔)
۱۹ : سید محمد گیسو دراز ۔ (م : ۸۲۵ھ۔)

ان انیس بزرگوں کا ذکر جمیل پانچ سو بیس صفحات پر مشتمل ہے۔

صوفیۂ کرام کے بارے میں جو کتابیں لکھی گئیں، ان کے مطالعه سے عام طور پر یه تاثر هوتا ہے که وه شریعت کے عالم نہیں هوتے تھے یا علمائے ظاهر کی طرح شریعت کا اتباع نہیں کرتے تھے ۔ ,,بزم صوفیه،، کی خوبی یه ہے که اس کے مطالعه سے نه صرف یه که اس قسم کا کوئی تاثر پڑھنے والے کے ذهن میں پیدا نہیں هوتا بلکه کافی حد تک اس کی نفی هوتی ہے۔ جن حضرات صوفیه نے کتابیں لکھیں ان کا بطور خاص ذکر کیا جیسے پیر سید علی هجویری رحمة الله علیه کی کشف المحجوب، اس کا نه صرف ذکر کیا ہے بلکه بھر پور تعارف کرایا ہے اور یه ثابت کیا ہے که کشف المحجوب، تصوف کی اولین اور بنیادی کتابوں میں سے ہے۔ کشف المحجوب اس بات کا ثبوت ہے که پیر سید علی هجویری رحمة الله علیه پیر طریقت بھی تھے اور شرعی علوم کے زبردست عالم بھی ۔

اکثر صوفیه نے اس انداز سے تصنیف و تالیف نہیں کی جیسا که علمائے ظاهر نے کی لیکن اس کے باوجود یه نہیں کہا جا سکتا که وه اس میدان میں خالی هاتھ هیں ۔ بعض بہت گراں قدر تالیفات هیں جو ان کے قلم سے نکلیں ۔ پھر ان کے ملفوظات بذات خود حکم و حکمت کا بیش قیمت خزانه هیں ۔ ان کے تلامذه نے بڑی توجه اور ذمه

داری کے ساتھ ان کے ملفوظات قلم بند کئیے اور وہ بعد میں اہل علم تک پہنچے، ان میں شرعی علوم سے متعلق ایسے اسرار و حِکَمْ ہیں جو بڑی بڑی تصانیف میں بھی نہیں ملتے ۔

صاحب بزم صوفیہ نے دیگر تذکرہ نویسوں کی طرح ان کتابوں کو نظر انداز نہیں کیا بلکہ پوری تفصیل کے ساتھ ان کا ذکر کیا ہے ۔ اور ان حضرات کی کتابوں سے ایسے اقتباسات نقل کئے ہیں جو اس بات کی نفی کرتے ہیں کہ یہ حضرات شرعی علوم کے ماہر نہیں تھے، یا علمائے ظاہر کی طرح شریعت کے پیروکار نہ تھے ۔

خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ کے ملفوظات سے جو دلیل العارفین کے نام سے شائع ہوئے ہیں، صاحب بزم صوفیہ نے یہ ملفوظ نقل کیا ہے :

,, تصوف نہ علم ہے نہ رسم، بلکہ مشائخ رحمہم اللہ کا ایک خاص اخلاق ہے ۔ صوری حیثیت سے اس اخلاق کی تکمیل یہ ہے کہ سالک اپنے ہر کردار میں شریعت کا پابند ہو ۔ جب اس سے کوئی بات خلاف شریعت سرزد نہ ہوگی تو وہ دوسرے مقام پر پہنچے گا جس کا نام طریقت ہے اور جب اس میں ثابت قدم رہے گا تو معرفت کا درجہ حاصل کرے گا، اور جب اس پر بھی پختہ ہو جائے گا تو حقیقت کا مرتبہ پائے گا،، (۱۵) ۔

خواجہ نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ کا ایک واقعہ نقل کرتے ہیں، اس سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ یہ حضرات شریعت کے کس درجہ پابند تھے اور لوگوں کو کن طریقوں سے اس کی پیروی اور پابندی کا درس دیتے تھے ۔ لکھتے ہیں :

,,ایک بار خواجہ نظام الدین اولیاء خلافت سے پہلے ایک مسجد میں بیٹھے کسی شرعی مسئلہ پر غور و فکر کر رہے تھے ۔ وہاں ایک مجذوب بھی تھا، وہ کہنے لگا : یا مولانا نظام

الدین ! علم بڑا حجاب ہے خواجہ نظام الدین کے دل میں یہ بات کھٹکی کہ علم حجاب تو ہو سکتا ہے لیکن بڑا حجاب کیسے ہو سکتا ہے۔ خواجہ اپنے مرشد بابا فرید الدین گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں پہنچے اور ان سے مجذوب کی یہ بات نقل کی ۔ بابا فرید الدین گنج شکر نے فرمایا : حجاب دو قسم کا ہوتا ہے ۔ ایک ظلمانی، اور دوسرا نورانی ۔ گناہ اور برائیاں ظلمانی حجاب ہیں ۔ جو شخص ان سے توبہ کرے گا اس کا گناہ معاف کر دیا جائے گا ۔ لیکن علم ایک نورانی حجاب ہے جس کو نہ ہر شخص عبور کر سکتا ہے اور نہ اس کے کنارے سے اٹھ سکتا ہے ۔ جس وقت تک شرعی علوم میں دستگاہ نہ ہوگی خدا کی محبت، معرفت، اور قربت حاصل نہیں ہو سکتی "(۱۶) ۔

حضرت بابا فرید الدین گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ نے ایک موقعہ پر اپنے مریدوں سے فرمایا :

"جب ایک آدمی تین باتوں سے اجتناب کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس سے تین چیزیں اٹھا لیتا ہے ۔ اول جو شخص زکوٰۃ نہیں دیتا تو اللہ اس کے مال میں سے برکت اٹھا لیتا ہے دوسرے جو شخص قربانی نہیں کرتا اللہ تعالیٰ اس سے سکون و عافیت چھین لیتا ہے تیسرے جو شخص نماز نہیں پڑھتا اللہ تعالیٰ مرنے کے وقت ایمان کو اس سے جدا کر دیتا ہے "(۱۷) ۔

خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ کے تذکرے کے ضمن میں لفظ سنجری اور سجزی کے بارے میں تحقیق کرتے ہیں ۔ اس کے تلفظ میں بڑے بڑے اہل علم نے ٹھوکر کھائی ہے کہ یہ لفظ س ، ن ، ج ، رہے یا : س ، ج ، ز ہے ۔ لکھتے ہیں کہ :

,, سیر العارفین میں آپ (خواجہ معین الدین چشتی سجزی) کے مولد شریف کا نام دار سنجان ہے اور سیر الاقطاب میں اصفہان لکھا، تاریخ فرشتہ جلد ۲، صفحہ ۳۷۵ میں ہے: ,,تولد او در بلدہ سجستان بود،، ۔ اکبر نامہ میں ہے: ,,خواجہ از سیستان است و اورا سنجری نوسید کہ معرب سنگری است،، ۔ (جلد ۲، ص: ۱۵۴) تزک جہاں گیری میں ہے: مولد آں جناب سیستان است ازیں جہت ایشاں را سنجری نویسند کہ معرب سنگری است،، ۔ (ص: ۴) راقم الحروف کے خیال میں سنجری کتابت کی غلطی ہے جو عوام و خواص میں پھیل گئی ہے ۔ دراصل صحیح لفظ سجزی (س، ج، ز، ی) ہے ۔ عرب جغرافیہ نویس سیستان یا سجستان کو سجز (س، ج، ز) بھی کہتے تھے ۔ جس کی نسبت سجزی (س، ج، ز، ی) ہے ۔ اس لئے معین الدین سنجری کے بجائے سجزی صحیح ہے ۔ (۱۸)

صوفیہ کے بارے میں یہ تصور بھی غلط ہے کہ وہ عملی زندگی سے کنارہ کش ہوتے تھے ۔ یہ تو کہا جا سکتا ہے کہ وہ عہدہ اور اقتدار سے دور رہتے تھے بلکہ اس بات کو بھی پسند نہیں کرتے تھے کہ بادشاہ وقت یا کسی حاکم اعلی سے تعلق رکھیں، بہت سے بادشاہ صوفیہ کے معتقد اور مداح گزرے ہیں، وہ ان کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے اور اس بات کی کوشش کرتے تھے کہ ان حضرات کی خدمت کریں ۔ مگر یہ اس کو بھی گوارا نہیں کرتے تھے ۔

خواجہ نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ کی ابتدائی زندگی عسرت اور تنگدستی میں گزری ۔ کسی نے سلطان جلال الدین خلجی کو خبر دی کہ حضرت خواجہ عسرت کی زندگی گزار رہے ہیں ۔ اس نے پیغام بھیجا کہ: اگر حضرت اجازت دیں تو خدمت گزاروں اور درویشوں کے لئے کچھ گاؤں نذر کئے جائیں ۔ حضرت خواجہ نے

مریدوں سے ذکر کیا تو کہنے لگے : اے محبوب الہی : ہم کبھی کبھی آپ کے گھر سے روٹی کھا لیتے ہیں ۔ اگر آپ نے سلطان کے یہ گاؤں قبول کر لئے تو اس کے بعد ہم آپ کے یہاں پانی بھی نہیں پیئیں گے"(۱۹) ۔ یہ سن کر خواجہ بہت مسرور ہوئے ۔ صبروقناعت اور سرکار و دربار سے بےنیازی کا یہ حال تو مریدوں کا تھا، بھلا شیخ اور پیر کہاں شاہی مراعات قبول کرتے ۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ صوفیہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہتے ہیں وہ کسب حلال کے قائل تھے، اور نہ صرف اپنی روزی کسب حلال کے ذریعے حاصل کرتے تھے بلکہ غریبوں، مسکینوں اور درویشوں کو بھی کھلاتے تھے ۔ ان سے بھی کبھی غافل نہیں ہوتے تھے ۔ حضرت بہاء الدین زکریا ملتانی رحمۃ اللہ علیہ وسیع کاروبار کے مالک تھے، ان کی مسجد اور خانقاہ میں جتنے مسافر اور درویش رہتے تھے سب کے خورد و نوش کا انتظام ان کی طرف سے ہوتا تھا ۔

حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء کو جب اللہ نے فراخی عطا کی تو انھوں نے یہ معمول بنا لیا تھا کہ اس وقت تک کھانا نہیں کھاتے تھے جب تک تمام درویشوں کو کھانا نہیں پہنچ جاتا تھا، روزہ افطار کرنے بیٹھتے تو محلہ کے تمام غریبوں اور حاجت مندوں کو پہلے کھانا بھجواتے اور پھر خود کھانا کھاتے ۔

حضرت اشرف جہانگیر سمنانی رحمۃ اللہ علیہ کے ملفوظات سے ایک اقتباس صاحب بزم صوفیہ نے نقل کیا ہے جس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ حضرات صوفیہ نے بادشاہان وقت سے کنارہ کشی کی، درویشانہ زندگی گزاری لیکن اپنی روزی کے لئے کسی پر نظر نہیں کی ، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کی سنت اور طریقہ کے مطابق اپنی محنت اور ہنر سے کمایا، خود اپنا پیٹ بھی اس سے بھرا، اور عزیز و اقارب، ہمسایوں، حتی کہ مریدوں اور

درویشوں کو بھی اس میں سے کھلایا ۔ پیغمبرانہ طریق کے مطابق کچھ بچا کر نہیں رکھتے تھے ۔ خواجہ نظام الدین اولیاء کے تذکرے ھی میں لکھا ہے کہ: جو کچھ ھدایا اور تحائف آتے انھیں بھی شام تک غریبوں، اور درویشوں میں تقسیم کر دیتے، اور جمعہ کے روز لنگر خانے کا خود معائنہ فرماتے کہ اس میں کوئی چیز باقی تو نہیں، جھاڑو دلواتے اور اس کے بعد نماز جمعہ کے لئے تشریف لے جاتے،،(۲۰)۔

حضرت شیخ جہانگیر سمنانی فرماتے ھیں :

،، اکثر مشائخ کوئی نہ کوئی پیشہ کرتے تھے اور دل و جان سے اس کی طرف بڑھتے تھے، اگلے مشائخ اور علماء بھی کسی نہ کسی پیشے میں مشغول رھتے تھے اور ان کو موجب عزت سمجھتے تھے ۔ بدقسمتی سے ھندوستان میں پیشہ اختیار کرنا بری خصلت سمجھا جانے لگا اسی وجہ سے محتاجی اور فقیری میں مبتلا ھوگئے ۔ یہ نہیں جانتے کہ اکثر انبیاء کسی نہ کسی پیشہ کی طرف منسوب ھیں، اس لئے پیشہ کی توھین کرنا ایک قسم کا کفر ہے ،، (۲۱)۔

حضرت اشرف جہاں گیر سمنانی نے ایک سالک کو معاشرتی حیثیت سے بھی اعلی قسم کے اوصاف سے متصف ھونے کی تلقین کی ہے۔

صاحب بزم صوفیہ نے ایسے بہت سے واقعات اور خود بزرگان دین کے اقوال نقل کئے ھیں جن سے ثابت ھوتا ہے کہ یہ حضرات جہاں ایک طرف عبادت و ریاضت میں مشغول رھتے تھے، اور ذکر الھی ان کا اوڑھنا بچھونا تھا، وھاں کسب معاش سے غافل نہیں ھوتے تھے ۔ توکل اور استغناء کی تمام تر صفات کے باوجود اپنی روزی کے لئے کسی کی طرف نظر نہیں رکھتے تھے ۔ اپنی روزی جائز اور حلال طریقوں سے خود کماتے تھے ۔ اللہ ان کو جو رزق عطا کرتا تھا وہ

سب غریبوں اور مسکینوں میں تقسیم کر دیتے تھے ۔ دراصل ان حضرات کے پیش نظر صرف یہ بات رہتی تھی کہ اللہ کے بندوں کی خدمت کی جائے ۔ نبی علیہ السلام کا یہ فرمان کبھی ان کی نظروں سے اوجھل نہیں ہوتا تھا کہ : جو مسلمان اپنے کسی بھائی کی مدد میں لگا رہے گا تو اللہ تعالیٰ اس کا معین و مددگار ہوگا ۔ (۲۲)۔

قرآن حکیم نے ,,سیروا فی الارض،، کا حکم دیا، حضرات صوفیہ نے ظاہری اور باطنی علم کی تلاش میں اللہ کے اس حکم پر خوب عمل کیا ۔ برصغیر پاک و ہند کے صوفیہ نے ایران ، ترکستان، سمر قند و بخارا، اور بلاد عرب کی وسیع تر سیاحت کی، برسہا برس ان علاقوں میں قیام کیا ۔ اور وہاں کے اہل ظاہر اور اہل باطن دونوں طبقوں سے استفادہ کیا ۔ حصول علم کے سلسلے میں صاحب بزم صوفیہ نے نقل کیا ہے کہ خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ نے ملتان میں پانچ برس قیام کیا اور وہاں رہ کر سنسکرت سیکھی (۲۳)۔

صوفیۂ کرام کے ذریعے اسلام کی تبلیغ و اشاعت اس لئے بھی زیادہ ہوئی کہ انھوں نے اپنے درس، اور وعظ و تبلیغ کو عربی زبان تک محدود نہیں رکھا، علاقائی زبانوں کو استعمال کیا اور انہیں وعظ و نصیحت کا ذریعہ بنایا ۔

صاحب بزم صوفیہ نے بعض صوفیہ کا فارسی کلام بھی نقل کیا ہے۔ اس سے جہاں ان کے نفیس اور بلند پایۂ ذوق شعری کا پتہ چلتا ہے وہاں اس بات کی بھی نفی ہوتی ہے کہ ان حضرات کی زندگی صرف چند کشف و کرامات کے گرد گھومتی ہے ۔

شیخ فخر الدین عراقی کے فارسی اشعار، قصائد اور رباعیاں نقل کی ہیں، وہ نہ صرف معانی و مطالب کے اعتبار سے بلکہ زبان و بیان کے نقطہ نظر سے بھی بہت بلند ہیں ۔

ایک غزل کے اشعار ھیں:

بیا اے دیدہ تایکدم بگریم نیم چون خوش دل و خرم بگریم
گہے از درد بے درمان بنالیم گہے از زخم بے مرھم بگریم
نشد جان محرم اسرار جانان بران محروم نامحرم بگریم
عراقی را کنون ماتم بداریم بران مسکین دریں ماتم بگریم

عراقی کے مندرجہ ذیل اشعار بہت مشہور ھیں، اور حال و قال کی مجلسوں میں خوب پڑھے جاتے ھیں :

به زمیں چو سجده کردم ز زمیں ندا برآمد
که مرا خراب کردی تو به سجده ریائی
چو براه کعبه به حرم رهم ندادند
که برون در چه کردی که درون خانه آئی (۲۴)

خلاصہ کلام یہ کہ ,,بزم صوفیہ،، بزرگان دین کے عام تذکروں سے بالکل مختلف ہے۔ اس کے مطالعہ سے ھرگز یہ تاثر نہیں ھوتا کہ صوفیۂ کرام نے صرف خانقاھوں میں بیٹھ کر زندگی گزاری ہے۔ یا عمل کی دنیا میں ان کی زندگی ادھوری اور ناتمام تھی۔ اس کتاب کا مطالعہ قاری کو یہ تاثر دیتا ہے کہ صوفیہ کی زندگی صبر، قناعت اور توکل کا مرقع تھی، وہ اس علم اور عمل کے جامع تھے جو ایک مومن صادق کا مقصود حقیقی ھونا چاھیے، انھوں نے اپنی ذات سے زیادہ دوسروں پر توجہ دی، خود مشکل، اور مصیبت میں ھوتے ھوئے دوسروں کی ضرورتیں پوری کیں۔ تبلیغ دین اور خدمت خلق کو اپنی زندگی کا حاصل بنایا۔

فاضل مولف سے بعض تسامحات بھی ھوئے ھیں، ان کا ذکر بھی غیر مناسب نہ ھوگا اور اس یقین کے ساتھ ان کی نشان دھی کر رھا ھوں کہ اتنی ضخیم کتاب میں اس قسم کے دوچار تسامحات ھرگز اس کی اھمیت و افادیت کو کم کرنے کا باعث نہیں بنیں گے۔ مثلاً حضرت پیر سید علی ھجویری رحمة اللہ علیہ کے تذکرے میں خواہ معین الدین چشتی رحمة اللہ علیہ کا وہ شعر جو انھوں نے حضرت کے

مزار مبارک پر چلہ کھینچنے کے بعد واپسی پر لکھا تھا ۔ یوں نقل کیا ہے :

گنج بخش هر دو عالم مظهرنور خدا کاملاں را هنر کامل، ناقصاں را رهنما

حالانکہ یہ شعر تمام تذکرہ نگاروں نے اِس طرح نقل کیا ہے :

گنج بخشِ فیض عالم مظهرِ نورِ خدا ناقصاں را پیرِ کامل، کاملاں را رهنما

اور اسی طرح حضرت کے مزار مبارک پر لکھا ہوا ہے ۔

دوسرے حضرت بہاء الدین زکریا ملتانی رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں لکھا ہے :

,,حضرت شیخ بہاء الدین زکریا کی نہ کسی تصنیف کا پتہ چلتا ہے اور نہ ملفوظات کا ذکر تذکروں میں ہے،، (۲۵) ۔

حضرت بہاء الدین زکریا ملتانی کی ایک تصنیف ,,الاوراد،، کے نام سے ہے اس بارے میں کافی تحقیق ہو چکی ہے ۔ ڈاکٹر مولوی محمد شفیع مرحوم کا مستقل ایک مقالہ اس بارے میں موجود ہے جو ان کے مجموعہ مقالات ,,مقالات علمی و دینی،، میں شامل ہے ۔ ,,الاوراد،، کا قلمی نسخہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں موجود ہے ۔ ۱۹۶۵ء میں ڈاکٹر شیخ محمد اکرام مرحوم (مصنف موج کوثر وغیرہ) نے ناچیز راقم سے کہا کہ وہ اس کی نقل و تصحیح کا کام سر انجام دے تاکہ اس کی طباعت ممکن ہو ۔ ناچیز نے اس مخطوطہ کو نقل کیا اور ۱۹۷۸ء میں اسلامک بک فاؤنڈیشن لاہور اور مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان کے تعاون و اشتراک سے یہ مخطوطہ شائع ہوا۔

مرکز تحقیقات فارسی ایران نے اس بات کی تصدیق کی کہ یہ حضرت بہاء الدین زکریا کی تصنیف ,,الاوراد،، کا مخطوطۂ قدیم ہے اور پہلی بار طباعت سے آراستہ ہو رہا ہے ۔

درگاہ بہاء الدین زکریا ملتانی کے سجادہ نشین جناب مخدوم سجاد حسین قریشی نے ,,الاوراد،، کی طباعت پر اس خواہش کا

اظہار کیا کہ ان کے پیرومرشـــد کی یہ تصنیف کیوں کہ عربی اور فارسی میں ہے اگر اس کا اردو ترجمہ ہو جائے تو ہر خاص و عام کے لئے اس سے استفادہ ممکن ہو۔ چنانچہ ۱۹۷۸ء میں ناچیز نے اس کا اردو ترجمہ کیا اور ابتداء میں ایک بسیط مقدمہ لکھا جس میں بطور خاص ,,الاوراد،، کے بارے میں اہل علم و فضل اور محققیـن کی تحقیقات کا حوالہ دیا اور یہ ثابت کیا کہ ,,الاوراد،، حضرت بہاء الدین زکریا رحمۃ اللہ علیہ کی تالیف ہے۔ اردو ترجمہ بھی بحمداللہ ۱۹۸٦ء میں شائع ہو گیا ہے۔

اس قسم کے تسامحات اکثر اہل علم سے ہو جاتے ہیں کیوں کہ ہم میں سے کسی کا بھی علم تمام معلومات کو محیط نہیں ہے۔

کتاب میں اگرچہ انیس صوفیۂ کرام کا تذکرہ ہے لیکن ضمنی طور پر برصغیر کے تمام صوفیہ کی تاریخ سامنے آ جاتی ہے۔ صوفیہ نے تبلیغ و اشاعت اسلام کے سلسلے میں برصغیر میں جو کردار ادا کیا ہے وہ بھی بڑے واضح اور نمایاں طریقہ سے سامنے آ جاتا ہے۔

کتاب کا انداز بیان عام فہم ہونے کے ساتھ دلکش بھی ہے اور یقیناً ,,بزم صوفیہ،، سیرۃ و سوانح کے ذخیروں میں ہی نہیں اُردو ادب میں بھی ایک گراں قدر اضافہ ہے۔

حـــوالہ جات و حواشی

۱ ۔ فتوح البلدان ۔ بلاذری۔ ص : ۳۲۵ ۔ طبع قاہرہ ۱۹۳۲ء

۲ ۔ ایضاً ۔ ص : ۳۲۹

۳ ۔ المؤطا ۔ امام مالک بن انس ۔ باب ماجاء فی حسن الخلق ۔

۴ ۔ تاریخ تصوف ۔ یوسف سلیم چشتی ۔ ص : ۱۳۷ ۔ طبع لاہور ۱۹۷٦ء

۵ ۔ کنز العمال ۔ شیخ علی المتقی ۔ کتاب الاخلاق ۔

٦ ـ بزم صوفیه ـ صباح الدین عبدالرحمن ـ ص : ١، ٢ ـ طبع اعظم گڑھ ١٩٣٩ء ـ
٧ ـ ایضاً ـ (تمہید) ـ ص : ٣ ـ
٨ ـ ایضاً ـ
٩ ـ اصول اسلام ـ مولانا محمد ادریس کاندھلوی ـ ص : ٢٧ ، ٢٨ ـ طبع لاہور ١٣٧٦ ھ ـ
١٠ ـ بزم صوفیه ـ ص : ٥ ـ
١١ ـ ایضاً ـ ص : ١٣٣ ، ص : ٣٣ ـ
١٢ ـ ایضاً ـ ص : ٧ ـ
١٣ ـ ایضاً ـ ص : ٦ ، ٧
١٤ ـ سیر العارفین ـ حامد بن فضل اللہ جمالی ـ ج : ٢ ، ص : ١٢٩ ـ (اردو ترجمه : محمد ایوب قادری) ـ طبع مرکزی اردو بورڈ لاہور ١٩٨٧ء ـ
١٥ ـ بزم صوفیه ـ ص : ٥٣ ، ٥٥ ـ
١٦ ـ ایضاً ـ ص : ١٥٠ ـ
١٧ ـ ایضاً ـ ص : ١٥١ ـ
١٨ ـ ایضاً ـ ص : ٣٥ (حواشی)
١٩ ـ ایضاً ـ ص : ١٨٧ ـ
٢٠ ـ ایضاً ـ ص : ٢١٣ ـ
٢١ ـ ایضاً ـ ص : ٣٨٠ ـ
٢٢ ـ سیرة النبی ـ سید سلیمان ندوی ـ ج : ٦، ص : ٢٥ ـ طبع نیشنل بک فاؤنڈیشن اسلام آباد ـ
٢٣ ـ بزم صوفیه ـ ص : ٣٣ ـ
٢٤ ـ أیضاً ص : ١٧٠ ـ
٢٥ ـ ایضاً ـ ص : ١٠٣ ـ

سلاطین، علماء اور مشائخ کے تعلقات

(ایک مطالعہ)

محمد طفیل

اسلام ایک ایسا دین ہے جو انسان کی تمام ضرورتوں کو پورا کرتا اور ہر زمانہ میں انسان کو مکمل رہنمائی فراہم کرتا ہے انسان کے جسمانی امور ہوں یا روحانی ۔ سب کیلئے دینی ہدایت فراہم کرتا ہے۔

اگرچہ اسلام نے جو احکام فراہم کئے ان کا تعلق بیک وقت انسان کی جسمانی اور روحانی ضرورتوں کی تکمیل سے ہے تاہم بعض اہل علم نے ظاہری اور جسمانی امور سے متعلق احکام کو شریعت اور روحانی تربیت اور تزکیہ باطن کو طریقت قرار دیا ہے شریعت کے احکام کا علم رکھنے ، ان پر عمل درآمد کرانے اور ظاہری امور پر شریعت کی بالادستی قائم کرنے والے حضرات ,,علماء،، کے لقب سے سرفراز ہوئے جبکہ انسان کے باطن کی اصلاح کرنے والے اور انسان کا روحانی رشتہ اسکے خالق حقیقی سے جوڑنے والے ,,اہل تصوف،، یا ,,صوفیہ،، کہلائے ۔

اگرچہ دین کی خدمت کرنے والا ہر فرد بہت اہم اور لائق تحسین ہوتا ہے۔ ,,کنتم خیر امة اخرجت للناس،، کے اس مقدس گروہ میں سے صوفیہ ممتاز مقام رکھتے ہیں ۔ یہ ایک ایسا گروہ ہے جو دنیا داری سے بےنیاز،محلات کی سیاست سے الگ تھلگ، صلہ و ستائش

کی تمنا کئے بغیر تزکیۂ قلوب کے عمل میں مصروف رہتا ہے۔

برصغیر کے حوالے سے اہل تصوف کی اہمیت مزید بڑھ جاتی ہے کیونکہ اس خطے میں اسلام صوفیۂ کرام نے ہی متعارف کرایا، انھیں کی تبلیغ اور حکیمانہ دعوت و ارشاد کے نتیجے میں بیشمار افراد حلقہ بگوش اسلام ہوئے ۔ یہ امر خاص طور پر قابل توجہ ہے کہ جو افراد صوفیۂ کرام کی کوششوں کے نتیجہ میں حلقہ بگوش اسلام ہوئے ۔ ان میں سے شاذ و نادر ہی کسوئی فرد دائرہ اسلام سے خارج ہوا ہو بلکہ ان کی صحبت صالحہ سے متأثر ہو کر اسلام قبول کرنے والے افراد عمدہ مسلمان، بہترین شہری، بلند اخلاق انسان اور اعلی قدروں کے امین ثابت ہوئے ۔ اور ان کے فیض یافتہ بےشمار افراد نے ترویج دین اور اشاعت اسلام کیلئے گراں قدر خدمات سرانجام دیں۔علماء اور صوفیہ نے جہاں عام طبقہ کے لوگوں کی اصلاح باطن کیلئے کوششیں کیں، وہاں سلاطین و امراء کی اصلاح پر بھی خصوصی توجہ دی ۔ اِس وقت ہمارے پیش نظر اسی موضوع پر تحریر کی گئی ایک بلند پایۂ کتاب ,,ہندوستان کے سلاطین، علماء اور مشائخ کے تعلقات پر ایک نظر،، ہے ۔ یہ کتاب برصغیر کے عظیم محقق، مؤرخ اور صوفی مولانا سید صباح الدین عبدالرحمن مرحوم کے رشحات قلم کا نتیجہ ہے جسے دارالمصنفین، شبلی منزل، اعظم گڑھ (بھارت) نے ۱۳۷۳ھ/۱۹۶۳ء میں شائع کیا تھا ۔ اس کتاب کی وجہ تالیف خود فاضل مصنف نے ان الفاظ میں بیان کی ہے۔

> ,,زیر نظر کتاب دراصل ایک مقالہ ہے جو پروفیسر محمد مجیب، شیخ الجامعہ ، جامعہ ملیہ اور مولانا عبدالسلام قدوائی، ناظم شعبہ دینیات، جامعہ ملیہ کی دعوت پر لکھا گیا ۔ اور وہاں ڈاکٹر سید عابد حسین کی صدارت میں پڑھا گیا ۔ ،، (۱)

مذکورہ بالا بیان سے واضح ہوتا ہے کہ زیر نظر کتاب کا نقش اول ایک توسیعی خطبہ کے طور پر مرتب ہوا، جو جامعہ ملیہ میں پڑھا گیا۔

بعد ازاں مروجہ علمی دستور کے مطابق یہ مقالہ برصغیر کے بلند پایۂ علمی مجلہ ,,معارف،، اعظم گڑھ میں قسط وار شائع ہوتا رہا اور اہل علم کی قیمتی آراء اور مشوروں کی روشنی میں مناسب حک و اضافے کے بعد کتاب کی شکل میں طبع ہوا۔

جیسا کہ کتاب کے نام سے عیاں ہے کہ اس کا موضوع بہت وسیع ہے۔ ایک طرف تو یہ کتاب برصغیر میں مسلمانوں کی ساڑھے چھ سو سالہ تاریخ کا احاطہ کرتی اور اس خطہ کے سیاسی اتار چڑھاؤ اور عروج و زوال کی داستان ہے تو دوسری جانب اس کتاب میں درج ذیل اہم موضوعات کو زیر بحث لایا گیا ہے۔

۱۔ صوفیۂ کرام اور سلاطین ہند کے تعلقات

۲۔ علمائے کرام اور ہندوستانی حکمرانوں کے باہمی روابط

۳۔ صوفیۂ کرام اور علمائے کرام کے باہمی مراسم۔

اس کتاب کے موضوع پر غور کیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ زیر نظر موضوع نیا نہیں ہے اور نہ ہی مولانا سید صباح الدین مرحوم نے اس موضوع پر پہلی بار قلم اٹھایا۔ بلکہ مسلمان حکمرانوں کے دور میں تاریخ کی جو کتابیں عموماً فارسی زبان میں مرتب ہوئیں یا سلاطین ہند کے جو روزنامچے لکھے جاتے رہے، ان میں دیگر موضوعات کے ساتھ ساتھ سلاطین سے علماء اور مشائخ کے تعلقات کو خاص اہمیت دی جاتی رہی۔ مسلمان بادشاہ کسی بزرگ یا عالم سے ملاقات کرتے یا صوفیہ اور علماء انہیں دین کی دعوت کی غرض سے کبھی ان سے کوئی رابطہ قائم فرماتے تو تاریخ نویس ایسے واقعات و حوادث کو خاص اہمیت دیتے اور اپنی تحریروں میں انہیں مناسب جگہ دیتے تھے۔ جن کا سلسلہ تاریخ یمینی سے رقعات عالمگیری تک

پھیلا ہوا ہے چنانچہ یہی تواریخ اور طبع شدہ روزنامچے زیر نظر کتاب کے بنیادی مآخذ ہیں اور فاضل مصنف نے انہیں کتب سے استفادہ کیا اور زیادہ تر مواد انہیں فارسی کتب سے حاصل کیا ۔ مزید برآں فاضل مصنف کی زیر تبصرہ کوشش سے پہلے دیگر اہل علم اس موضوع پر بہت سی کتب ترتیب دے چکے ہیں ۔ ایسی کتب میں حضرت علی ہجویری کی کشف المحجوب، خواجہ نظام الدین اولیاء کی فوائد الفؤاد، شرف الدین یحیی منیری کے خطوط اور مولانا عبدالحق کی تصانیف کا خاص طور سے ذکر کیا جا سکتا ہے ۔ خاص طور پر علمائے کرام کے حالات و خدمات کو ضبط تحریر میں لانے کی کئی سنجیدہ کوششیں ہو چکی تھیں ۔ جن میں سے بعض یہ ہیں ۔

١ ۔	علمائے ہند، مصنفہ عبدالرحمن	یہ کتاب فارسی میں لکھی گئی اس کا اردو ترجمہ طبع ہو چکا ہے ۔
٢ ۔	علمائے ہند کا شاندار ماضی مصنفہ مولانا سید محمد میاں	یہ کتاب چار جلدوں میں اردو میں طبع ہوئی ۔
٣ ۔	شیخ محمد اکرام کا سلسلہ کوثریات	آب کوثر، رود کوثر اور موج کوثر مراد ہیں ۔
٤ ۔	ڈاکٹر زبید احمد	India's Contribution to Arabic Literature
٥ ۔	ڈاکٹر محمد اسحاق	India's Contribution to the Study of Hadith Literature
٦ ۔	,,حدائق الحنفیہ،، مصنفہ فقیر محمد جہلمی	یہ کتاب اردو زبان میں ہے اور حنفی فقہاء کے حالات سے بحث کرتی ہے اس کتاب میں برصغیر کے علماء کو مناسب مقام دیا گیا ہے ۔

نیز علمائے کرام کے حالات بیان کرنے کیلئے دوسری انفرادی سوانح عمریاں اور اجتماعی تذکرے بھی طبع ہو چکے تھے ۔ اور زیر مطالعہ کتاب میں ان کے حوالے بھی ملتے ہیں ۔ اندازہ ہوتا ہے کہ

مولانا سید صباح الدین مرحوم نے اپنی کتاب کا خام مواد انہیں مصادر سے حاصل کیا تھا ۔ یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ فاضل مصنف نے اس وسیع مواد کا گہرا مطالعہ کیا، اپنے موضوع سے متعلق مواد پوری دیانت اور ذمہ داری سے اکٹھا کیا اور پھر اس مواد کو جس عمدہ اور منظم و مرتب انداز میں پیش کیا یہ انہیں کا حصہ ہے۔ ان کی کوششوں سے اپنے موضوع پر ایک ایسی کتاب مرتب ہو گئی ہے جسے ہمیشہ مأخذ کی حیثیت حاصل رہے گی ۔

اس مختصر سی تمہید کے بعد ہم کتاب کے مندرجات پر غور کرتے ہیں اور کوشش کریں گے کہ کتاب کے موضوعات سے قارئین کو متعارف کرا سکیں، جیسا کہ پہلے ذکر ہوا اور کتاب کے نام سے بھی عیاں ہے کہ یہ کتاب اسلامی ہند کے مذہبی، ذہنی، فکری اور ضمناً سماجی اور ثقافتی حالات سے متعارف کراتی ہے ۔ واضح رہے کہ یہ دور قریباً ساڑھے چھ سو سال پر محیط ہے جو تیرھویں صدی عیسوی سے شروع ہو کر انیسویں صدی عیسوی کے نصف اول تک پھیلا ہوا ہے اور اس طویل عرصہ میں ۳۸ بادشاہ سلطنت ہند کی مسند پر متمکن رہے ۔ جن میں دیندار، دین کا درد رکھنے والے، رند، بدمست اور دین سے لاپرواہی برتنے والے سبھی طرح کے سلاطین شامل ہیں ۔

اس جگہ ایک دلچسپ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ برصغیر کے جس عہد پر ہم گفتگو کر رہے ہیں کیا وہ دور اسلامی تھا؟ اس دور کے حکمران مسلمانوں کے صحیح نمائندے تھے ، جو خلاف اسلام کوئی کام نہیں کرتے تھے؟ کیا اس وقت کا ہندوستان اسلامی سلطنت کہلا سکتا تھا یا نہیں؟ مختصر یہ کہ اس دور میں اسلام کی کیا حیثیت تھی؟ واضح رہے کہ ان نکات پر روشنی ڈالنے سے علمائے کرام اور مشائخ عظام کا منصب و مرتبہ متعین کرنے میں بھی مدد ملے گی ۔

یہ سوالات بہت ہی اہم ہیں ۔ ان کا جواب ہندوستانی مذہب و سیاست دونوں کے عمیق مطالعے کے بعد دیا جا سکتا ہے ۔

جو بادشاہ ہندوستان کی مسند حکومت پر متمکن ہوئے وہ اسلام کے نام لیوا تھے ۔ انہوں نے نہ صرف اسلامی لقب اختیار کرنا ضروری خیال کیا بلکہ وہ بغداد میں مقیم مسلمان خلیفہ سے باقاعدہ اجازت نامہ بھی لیا کرتے تھے اور ان سے پروانہ تقرری بھی حاصل کیا کرتے تھے ۔ وہ جو کچھ کرتے اسلام کے نام پر کرتے ۔ ان میں سے جو بھی تخت نشین ہوتا، اسلامی روایات کے مطابق اپنے وقت کے امراء سے بیعت لیتا، وہ ناصر امیرالمؤمنین اور نائب امیر المومنین جیسے القاب سے اپنے ناموں کو مزین کرتے ۔ وہ کوشاں رہتے کہ اپنے دور حکومت میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا نظام قائم کریں اور نظام احتساب کے قیام میں کوئی کوتاہی نہ کریں ۔

ان کوششوں اور اسلامی خدمات کے باوجود ہندوستان کے حکمرانوں کو مسلمانوں کے نمائندہ تسلیم نہیں کیا جاتا، ان کے اسلامی کارناموں کو ان کی ذاتی نمود و نمائش قرار دیا جاتا ہے کیونکہ ان کی حکومتیں اسلامی معیار اور نظام عدل کے اصولوں پر قائم نہیں رہیں ۔ حکمرانوں کی چھوٹی بڑی کمزوریوں اور کوتاہیوں کو نظر انداز بھی کیا جائے تب بھی یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ سلاطین ہند جیسے بھی تھے وہ مسلمان مذہب پر قائم رہے ۔ انہوں نے اپنے اپنے ادوار میں نفاذ اسلام کی حتی المقدور کوشش کی ۔ انہیں کے ذریعے یہاں ہماری مذہبی اور ثقافتی تاریخ تشکیل پائی اور غیر مسلم مورخین انہیں کے کارناموں کی روشنی میں اسلام کا جائزہ لیتے ہیں ۔

اس لئے سلاطین ہند کی اسلامی حیثیت متعین کرتے وقت ہمیں خاص احتیاط سے کام لینا ہوگا ۔ یہی وجہ ہے کہ انہیں مسلمانوں کا نمائندہ تسلیم کرتے ہوئے ہندوستان کو ,,دارالسلام،، قرار دینا چاہئیے ۔

علماء اور صوفیۂ کرام کو ہندوستان میں اشاعت اسلام کا جو سنہری موقع میسر آیا وہ بھی حکمران ہند کا مرہون منت ہے ۔

کیونکہ غزنویوں کی آمد سے قبل شاذ و نادر ھی کوئی عالم دین یا صوفی تبلیغ اسلام کیلئے ھندوستان آیا ۔ یہ بادشاھوں کا لشکر تھا جس میں علماء اور صوفیۂ کرام کا ایک بڑا گروہ ھندوستان آیا اور انھوں نے یہاں تبلیغ اسلام کا فریضہ سرانجام دیا ۔ اسی طرح بادشاھان ھند ان علمائے کرام اور مشائخ عظام کی قدر دانی کرتے رھے جو مختلف مقامات سے ھجرت کر کے ھندوستان آ کر آباد ھوئے۔چنانچہ نیشاپور، صغان، غزنی، کاسان، بلخ، سجستان خوارزم اور تبریز وغیرہ سے علمائے کرام نے ھجرت کی اور ھندوستان میں آ کر مقیم ھوئے ۔ انھیں علمائے کرام کی بدولت ھندوستان میں اسلام کو عروج ملا ۔ یہ سلسلہ سلاطین دھلی اور مغلیہ دور تک قائم رھا ۔ نیز انھیں علماء اور فقھاء کے ساتھ جو فقہ اسلامی ھند میں داخل ھوئی وھی یہاں رائج ھو گئی۔ جسکی مدون شکل فتاوی تاتار خانی اور فتاوی عالمگیری وغیرہ جیسی بلند پایہ کتب کی شکل میں موجود ہے ۔ اس طرح ھندوستان کے مسلم حکمرانوں نے بالواسطہ اسلام کی گراں قدر خدمت سرانجام دی ۔

علمائے کرام اپنی زندگیاں تبلیغ و اشاعت اسلام کیلئے وقف کر دیتے تھے اور وہ معاشرے کے مہذب، تعلیم یافتہ اور قادرالکلام طبقہ پر مشتمل ھوتے تھے نیز یہی گروہ علمی قیادت کرتا اور تعلیم دیتا تھا ۔ دین کی تبلیغ و اشاعت، بادشاھوں کو پند و نصائح کرنا ۔ سیاست جہانبانی کے اصول ھوں یا جنگ و صلح کے قوانین، مذھبی فرائض کی بجاآوری ھو یا معاشرتی وسماجی برائیوں کا قلع قمع ان سب امور کی بجا آوری میں علمائے کرام پیش پیش ھوتے ۔ اس لئے انھیں معاشرے میں ھمیشہ نمایاں مقام حاصل رھا ۔ اور وہ ایک ایسا مضبوط گروہ تسلیم کئے جاتے رھے ۔ چنانچہ جو حکمران اور بادشاہ ان سے خوشگوار تعلقات قائم رکھتے وہ حتی الوسع سر عام خلاف شریعت

کام نہ کرتے کیونکہ دین کے خادموں اور عوام کے دینی رہنماؤں کی حیثیت سے انہیں یہ اختیار حاصل ہوتا تھا ۔ کہ خلاف شریعت کام کرنے پر وہ حاکم وقت کا سر عام احتساب کریں اور حاکم و بادشاہ کو ان کے سامنے جواب دہ سمجھا جاتا تھا ۔ کیونکہ اگر کوئی حکمران اسلامی احکام کی خلاف ورزی کرتا اور علمائے کرام اس کی کوتاہیوں کی نشاندھی کر دیتے تو ایسے بادشاہ و سلاطین نہ صرف عوام میں اپنی عزت و وقار کھو بیٹھتے بلکہ ان کی حکومت کو بھی خطرہ لاحق ہو جاتا تھا۔چنانچہ پوری رواداری اور دبدبہ کے باوجود اکبر کی حکومت اور اس کا خود ساختہ دین الہی ہندوستان میں نہ پنپ سکے کیونکہ انہیں جمہور علماء کی تائید حاصل نہیں تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان میں علماء اور سلاطین کے خوشگوار تعلقات کا قیام وقت کی ایک اہم ضرورت تھی تاکہ حکمران اپنی حکومت قائم رکھ سکیں اور علمائے کرام کسی تصادم، مداخلت اور خلفشار کے بغیر اسلام کی ترویج و اشاعت کا فریضہ خوش اسلوبی سے سرانجام دیتے رہیں ۔ (ملاحظہ کیجئے زیر تبصرہ کتاب ص ۵ ۔ ۱۲)

سلاطین دھلی اور شاھان مغلیہ کے ادوار کا جائز لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت کے علمائے کرام کو بہت سی اقسام میں تقسیم کیا جا سکتا ہے ۔ پہلی قسم کے علمائے کرام میں وہ بلند پایہ اھل علم آتے ھیں جو حکمران طبقہ سے قطعاً میل جول نہیں رکھتے تھے ۔ ایسے علماء میں مولانا کمال الدین، مولانا عبدالرشید جونپوری، مولانا ابوالقاسم وغیرہ کے اسمائے گرامی ذکر کئے جا سکتے ھیں ۔ ان میں سے ہر ایک سے بادشاہ وقت نے خود رابطہ قائم کیا ۔ اور ان سے تعلقات استوار کرنے کی خواھش اور کوشش کی لیکن ان میں سے ہر ایک اپنی دھن میں اس قدر مگن تھا کہ کسی نے بادشاہ وقت کی

کوئی پرواہ نہیں کی ۔ اور حکمرانوں سے بالکل روابط قائم نہیں کئے۔ اس بارے میں مولانا ابوالقاسم کے وہ حروف سونے کے پانی سے لکھے جانے کے قابل ہیں جو انہوں نے عالمگیر کی ان سے ملاقات کیلئے خواہش ظاہر کرنے کے جواب میں معمولی کاغذ پر تحریر فرمائے تھے ۔

,,اہل اللہ کا اس پر اجماع ہے کہ وہ فقیر بہت برا ہے جو کسی امیر کے آستانہ پر ہو ۔ حق سبحانہ فرماتا ہے کہ دنیاوی زندگی کا سرمایہ بہت ہی قلیل (۲) ہے ۔ تم کو اس کا بھی قلیل ترین جزو ملا ہے ۔ اگر بالفرض اس میں سے مجھے بھی دو گے تو وہ جزو لا یتجزّی ہوگا ۔ اس ٹکڑے کیلئے میں اپنے نام کو خداوند تعالی کے دفتر سے کیوں کٹواؤں ۔ چشت کے ملفوظات میں مذکور ہے کہ جس کا نام بادشاہ کے دفتر میں لکھا جاتا ہے ۔ حق تعالی کے دفتر سے اس کا نام کٹ جاتا ہے،، (۳)

دوسری قسم کے علماء وہ تھے جو درس و تدریس کے بلند پایہ کام میں مشغول تھے ۔ ایسے علماء عام طور پر دین کی تعلیم دیتے تھے جس کا نصاب قرآن حکیم کی ابتدائی ناظرہ تدریس سے لیکر اعلی دینی تعلیم پر مشتمل ہوتا تھا ۔ اس غرض کیلئے ہندوستان کے کونے کونے میں دینی مدارس قائم تھے ۔ جن کی مالی اعانت عوام اور حکومت کی مشترکہ ذمہ داری ہوتی تھی چنانچہ قلقشندی کا بیان ہے کہ محمد بن تغلق کے زمانہ میں صرف دھلی میں ایک ہزار دینی مدارس قائم تھے ۔ جن میں سے ایک مدرسہ شوافع کا اور باقی سب احناف کے مدارس تھے ۔ (۴) فیروز شاہ کے دور میں مدرسہ فیروز شاہی قائم ہوا اکبر نے فتح پور سیکری میں ایک مدرسہ قائم کیا، عالمگیر نے تمام شہروں اور قصبات میں مدارس بنوائے اس طرح ہندوستان میں دینی مدارس کا ایک جال بچھا ہوا تھا ۔ جن کی تفصیل مظفر ندوی کی مشہور کتاب ,,ہندوستان کی قدیم دینی درس گاہیں،، میں دیکھی جا سکتی ہے ۔

مدارس کے علماء خاموشی سے درس و تدریس میں مشغول رهتے ۔ وہ منقولات و معقولات، یعنی تفسیر، حدیث، فقه، اصول فقه، اصول دین، لغت، معانی، بدیع، بیان، منطق، کلام اور جملہ علوم و فنون کی تعلیم دیتے تھے ۔ جن کی بدولت هندوستان میں بڑے بڑے نامور علماء پیدا هوئے اور انهوں نے هندوستان سے نکل کر بیرونی دنیا میں بھی نام پیدا کیا اور اپنی قابلیت کا لوها منوایا ۔ نظام تعلیم کی تکمیل کے بعد جو نئے علماء فارغ هوتے وہ پورے ملک میں پھیل کر دین کی خدمت کا فریضه سر انجام دیتے ۔ اس طرح عوام کو دین کی تعلیم و رهنمائی ان کے اپنے علاقوں میں میسر آتی اور دینی تعلیم هی اس وقت ایسی تعلیم تھی جو علماء کی کوششوں سے عوام کو هر جگه اپنے اپنے گھر پر حاصل هوتی تھی ۔ چنانچه مولانا سید صباح الدین عبدالرحمن رقم طراز هیں ۔

,,ان علماء کے تلامذہ حصول تعلیم کے بعد ملک کے اطراف و جوانب میں پھیل جاتے،وهی عوام میں اسلام کے نقیب و محافظ هوتے ۔ یه جوش ایمانی سے معمور هوتے تھے اور ضرورت کے وقت اسلام کیلئے اپنی جان تک قربان کر دیتے تھے ۔ یه عوامی علماء عوام کو چھوٹے بڑے مذهبی مسائل سے واقف کراتے ۔ ان کی خلاف ورزی پر سختی کے ساتھ دار و گیر کرتے ۔ ان کے فتوؤں کا خوف عوام پر ایسا غالب رهتا تھا که گو وہ اپنی روز مرہ کی زندگی میں بهت سے غیر اسلامی اعمال کے مرتکب هوتے مگر اسلام کو اپنے سینوں سے لگائے رکھنے میں اپنی دنیاوی فلاح اور اخروی نجات سمجھتے ۔ یه ان هی عوامی علماء کا فیض ہے که هندوستان کے مسلمانوں نے مقامی اثرات تو ضرور قبول کئے ۔ لیکن اسلام سے بهت دور نهیں هونے پائے،، (زیر نظر کتاب ص ۱۶ ۔ ۱۷) ۔

ان دونوں اقسام کے علاوہ تیسری قسم کے علماء بھی ہوتے تھے ۔ جو علماء دربار اور سلطنت سے اپنے روابط قائم رکھتے تھے ۔ اور حکمران طبقہ کے ممد و معاون ہوتے تھے ۔ گوشہ نشین اہل علم ایسے علماء کو پسند نہیں کرتے تھے اور انہیں دنیا دار اور جاہ پرست شمار کرتے تھے ۔ جبکہ دربار سے وابستہ علمائے کرام کا موقف یہ ہوتا تھا کہ حکمران بھی انسان اور مسلمان ہوتے ہیں وہ بھی دینی رہنمائی اور تبلیغ کے محتاج ہیں اگر حکمران طبقہ کی اصلاح ہو جائے تو عوام کی اصلاح آسان ہوتی ہے کیونکہ ,,الناس علی دین ملوکھم (۵) ،، پر عمل کرتے ہیں اور یہ حقیقت ہے کہ دربار سے وابسطہ علماء مجموعی طور پر دربار، حکومت اور حکمرانوں پر اثر انداز ہوئے ۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ علمائے کرام نے جب بھی کسی حکمران کو خلاف شریعت کوئی کام کرتے ہوئے پایا ۔ انہوں نے فوراً اس کی اصلاح کی کوشش کی اور بعض اوقات پوری سختی سے کام لیا اور دین کے تقدس کو بچانے اور دینی احکام کو نافذ کرتے وقت کسی بھی قربانی سے دریغ نہیں کیا ۔ علماء کے درباری روابط سے منفی اور مثبت دونوں طرح کے اثرات مرتب ہوئے ۔ آئندہ سطور میں اس کی ایک جھلک پیش کرنے کی کوشش کی جائے گی ۔

یہ مشاہدہ ہے کہ دارالحکومت میں اہل علم و فن کثرت سے جمع ہوتے رہے۔اسکی ایک وجہ تو مالی دشواریوں پر قابو پانا اور روزگار کا حصول ہوگا ۔ لیکن اس کی بڑی وجہ یہ رہی کہ دارالحکومتوں میں ہی اہل علم و فن کی صحیح قدردانی، مقام شناسی اور پذیرائی ہوتی تھی ۔ کیونکہ دارالحکومتوں میں دنیا کے تمام خطوں سے اہل ثروت آ کر جمع ہوتے اور اہل علم و فن کی صلاحیتوں اور کارناموں سے آگہی حاصل کرتے نیز عام طور پر اہل علم و فن بھی دارالحکومتوں کا رخ کرتے، تاکہ وہاں اپنے علم و فن کے جوہر دکھا کر

اپنی قابلیت کا لوھا منوا سکیں ۔ اس طرح علماء کرام اور اھل حکومت کے تعلقات دور قدیم سے نہ صرف استوار ھوتے رھے بلکہ پروان چڑھتے رھے ۔

علماء اور سلاطین کے روابط پر گہری نظر ڈالی جائے تو اندازہ ھوتا ہے کہ یہ تعلقات یک طرفہ نہیں ھوا کرتے تھے ۔ کہ صرف علماء یا سلاطین میں سے کوئی ایک طبقہ تعلقات استوار کرتا اور دوسرا فریق اس بارے میں گریزاں ھوتا تھا ۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ علمائے کرام دینی فریضہ کی بجا آوری کے لئے اھل حکومت سے تعلقات استوار کرتے تاکہ انھیں دین کے قریب تر لا سکیں ۔ انھیں رسم حکمرانی اور احکام نگھبانی سے آگاہ کر سکیں ۔ جبکہ حکمرانوں کو نظام حکومت چلاتے وقت نت نئے مسائل کا سامنا ھوتا تھا ۔ انھیں بہت سے امور میں علمائے کرام کی رھنمائی اور مدد درکار ھوتی تھی ۔ نیز بادشاہ اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت کیلئے بھی اھل علم کے محتاج ھوتے تھے ۔ اس طرح سے علمائے کرام اور اھل حکومت کے روابط استوار ھوتے اور پروان چڑھتے۔ ممکن ہے بعض علماء دنیوی جاہ و حشمت اور حصول منصب کیلئے بھی ارکان حکومت سے رابطے استوار کرتے ھوں ۔ لیکن اھل علم کی غالب اکثریت دینی فریضہ کی بجا آوری ، حاکم وقت کی اصلاح، رعایا کی بہتری اور اس کے کمزور طبقوں کی آواز ایوان حکومت تک پہنچانے کیلئے وھاں تک رسائی حاصل کرتی تھی ۔

اس طرح سے حکمرانوں اور علمائے کرام کے جو باھمی تعلقات قائم ھوئے ان کے بہت سے مثبت اثرات مرتب ھوئے۔ان میں سے ایک پہلو یہ ہے کہ مسند حکومت پر متمکن اصحاب کو جب کوئی دینی مسئلہ درپیش ھوتا تو وہ علمائے کرام کی طرف رجوع کرتے ۔ اور وہ پیش آمدہ مسائل پر پوری تحقیق، دینی جذبہ و ذمہ داری، لگن اور

معاصرانہ حالات و ضرورت کے مطابق کتب و رسائل تصنیف کرتے ۔ اس طرح بہت سی کتب وجود میں آئیں اور علمی سرمایہ میں بیش بہا اضافہ ہوا ۔ چنانچہ ایسی کتب کا جائزہ لیا جائے جو اہل حکومت کی ضرورتوں کو پورا کرنے کیلئے تصنیف ہوئیں تو ان کی تعداد بہت زیادہ ہو گی ۔ اور یہ ایک دلچسپ مطالعہ ہو گا ۔ کیونکہ اس مطالعہ سے اسلامی تاریخ کے مختلف ادوار کے مسائل اور ان مسائل کے تنوع کو زمانی ترتیب سے جمع کرنے میں مدد ملے گی اور یہ اندازہ بھی ہوگا، کہ اہل حکومت اور اہل علم کے تعلقات نے تہذیب و ثقافت ، علمیت اور انسانیت کو کیا کچھ عطا کیا۔اس میں زیر نظر کتاب سے بھرپور فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے ۔

یوں تو علمائے کرام نے ہر موضوع پر اہل حکومت کو رہنمائی فراہم کی اور تصانیف یادگار چھوڑیں لیکن اہل علم اور اہل حکومت کے باھمی تعلقات سے ایک خاص علم وجود میں آیا ۔ یہ خاص علم آداب حکمرانی اور امور سلطنت کی نگہبانی اور رعایا کی بہبود، جنگ و صلح کے قوانین اور خارجی تعلقات جیسے موضوعات سے بحث کرتا ہے ۔ جسے اب باقاعدہ علم (Science) کا درجہ حاصل ہے ۔ ہماری مراد علم سیاست اور علم بین الاقوامی تعلقات سے ہے ۔ اس علم کا آغاز ھی اھل علم کی حکمرانوں کیلئے نصحیتوں سے ہوتا ہے چنانچہ اس موضوع پر جو کتب تصنیف کی گئیں انھیں جمع کر کے زیر مطالعہ لایا جائے تو اسلام میں حکمرانی کے اصول کھل کر سامنے آ جائیں گے اور اسلامی دنیا کے آج کے مسائل حل کرنے کیلئے بھی راھنمائی ملے گی ۔

اھل علم کے تصنیفی کارناموں کا جائزہ لیا جائے یا ان کی بادشاھوں سے مجالس کا تنقیدی مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ علماء کرام نے ھمیشہ جرأت اور صاف گوئی سے کام لیا ۔

انھوں نے کسی دینی حکم کو نہ چھپایا اور نہ ھی اسکی دور از کار رفتہ تاویل کر کے حکمرانوں کو خوش کرنے کی کوشش کی چنانچہ علاؤالدین خلجی اپنی سختی کیلئے مشہور تھا، جب اس نے قاضی مغیث الدین سے بعض دینی اور فقھی استفسارات کئے تو انھوں نے بڑی بےباکی اور جرأت سے جوابات دیئے اور کہا ,,کہ اگر بیت المال سے اپنے حق سے زیادہ مال لیا اور سونا اپنے حرم میں بھجوایا تو اس کی قیامت کے دن باز پرس ھو گی (٦) ،، ۔ ملا عبدالنبی اکبر کے دربار سے وابسطہ تھے ایک دفعہ اکبر نے اپنی سالگرہ کے موقعہ پر زعفرانی رنگ کے کپڑے پہننے تو ملا عبدالنبی نے سر دربار اس کی سرزنش کی تھی اس طرح اکبر نے جب دین الھی کے قیام کا اعلان کیا تو علمائے دین اور مفتیان شرع متین نے اکبر کے گمراہ اور بے دین ھونے کا فتوی صادر کیا جسکی پاداش میں انھیں جام شہادت نوش کرنا پڑا ۔ اس دور میں شیخ سرھندی کا کردار ایک صوفی کی عزیمت کا بےمثال درس ہے ۔

اھل علم اور اھل حکومت کے تعلقات کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ ھندوستان میں جو بھی فتنے پیدا ھوئے، علماء کرام نے ان کا ڈٹ کر مقابلہ کیا ۔ اھل حکومت کو ان فتنوں کی حقیقت سے مطلع کیا اور انھیں دور کرنے کی ھر ممکن کوشش کی ۔ ایسے امور میں فتنہ اباحت، فتنہ مہدویت، فرقہ روشنیہ اور اکبر کے دین الھی اور فتنہ فردوسی کا خاص طور سے ذکر کیا جا سکتا ہے ۔ اگر ان مذھبی نوعیت کے فتنوں کو فرو کرنے پر اھل علم مناسب توجہ نہ دیتے تو ھندوستان میں دین کی شکل مسخ ھو کر رہ جاتی ۔

اھل حکومت اور اھل علم کے مفید اور مثبت پہلوؤں کے ساتھ ساتھ بعض مضر اور منفی پہلوؤں کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ان میں سے ایک پہلو یہ ہے ۔ کہ خود علمائے کرام بہت ھی کم

امور پر متفق رہے ہیں ۔ ان میں اختلاف کا پیدا ہونا ایک معمول کی بات رہی اور کسی موضوع پر ان کا اتفاق شاذ و نادر ہی ہوا ۔ جسکی وجہ سے ایک طرف تو وہ اپنی پوری قوت کو جمع کرنے کے باوجود نفاذ اسلام میں ناکام رہے ۔ برصغیر میں کبھی بھی اسلام مکمل طور پر نافذ نہ ہو سکا ۔ اگر معاملہ یہیں تک رہتا تب بھی قابل قبول تھا ۔ لیکن یہ بات بڑے دکھ کے ساتھ ذکر کی جاتی ہے کہ دین کے خلاف جو بھی تحریکیں اٹھیں ۔ اور دینی تعلیمات کو پامال کرنے کیلئے جن فتنوں اور گروھوں نے سر اٹھایا ان کی قیادت اور پشت پناھی بھی علمائے کرام ھی کرتے رہے ۔ جن کے منفی اثرات سے معاشرہ محفوظ نہ رہا اور حکمرانوں کو جب علمائے سو کی حمایت اور تائید حاصل ہوئی تو انہوں نے بےشمار ایسے کام کئے جو نہ صرف خلاف شریعت تھے بلکہ ان سے دینی جذبے اور مقصد کو نقصان پہنچا ۔ علمائے کرام نے تقلید کی جس شد و مد سے حمایت کی ۔ اس سے اندھی تقلید کو فروغ ملا اور تخلیقی عمل مجروح ہوا ۔

اب تک ہم نے علمائے کرام کی خدمات، ان کی مروجہ اقسام ان کے سلاطین کے تعلقات کا جائزہ پیش کیا ۔ اھل علم اور اھل حکومت کے تعلقات کیوں اور کس طرح قائم ہوتے اور پروان چڑھتے رہے ؟ یہ موضوع بھی زیر بحث آیا نیز علمائے کرام اور حکمرانوں کے تعلقات کے مفید اور مضر پہلو اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ۔ آئندہ سطور میں ہم صوفیۂ کرام اور سلاطین کے باھمی تعلقات زیر بحث لائیں گے ۔ اسی طرح ان کے تعلقات کے مفید اور مضر پہلوؤں پر روشنی ڈالیں گے ۔

ہندوستان کے سیاسی، مذہبی اور ثقافتی تناظر میں دیکھا جائے ۔ تو یہ حقیقت عیاں ہوتی ہے کہ اسلام کی دعوت و تبلیغ اور تصنیف و تالیف میں علمائے کرام نے بیمثال خدمات سرانجام دی ہیں ۔ ان کی

دینی کاوشیں، دینی حمیت و غیرت کے مظاہرے اور مذہبی حق گوئی آب زر سے لکھنے کے قابل ہے۔ لیکن دلوں کو دین کے لئے تسخیر کرنے، غیرمسلموں کو حلقہ بگوش اسلام کرنے، دینی رواداری کا عملی مظاہرہ کرنے اور مساوات محمدی کی اصلی اور عملی شکل پیش کرنے میں جو کردار صوفیۂ کرام نے ادا کیا وہ نہ صرف بہت نمایاں ہے بلکہ یہ صوفیۂ ھی تھے جو ھندوستان جیسے نہایت پیچیدہ معاشرتی اور سماجی نظام میں نہ صرف خود نمایاں رھے، بلکہ انہوں نے دوسرے مذاھب اور دھرموں کو ماننے والوں کے سامنے اپنے کردار و عمل کا ایسا نمونہ پیش کیا ۔ کہ وہ اسلام کی حقانیت ، انسان دوستی رواداری اور مساوات کے قائل ھو کر حلقہ بگوش اسلام ھو گئے اور یہ حقیقت ہے کہ برصغیر میں اسلام صوفیۂ کرام کی بدولت پھیلا اور انہیں کی کوششوں کے نتیجہ میں باقی رھے گا ۔

سوال یہ پیدا ھوتا ہے کہ صوفیۂ کرام کون ھیں؟ اور ان کے پاس وہ کونسی قوت ہے جسکے ذریعے وہ براہ راست انسانی قلب پر اثر انداز ھوتے اور اسے خالق حقیقی کی طرف پھیرنے میں کامیاب ھو جاتے ھیں۔

اگرچہ یہ بہت پیچیدہ سوالات ھیں لیکن ان کا جواب بہت ھی آسان ہے کیونکہ اگر ھم تصوف کی ماھیت اور صوفی کی حقیقت پر غور کریں تو اس مسئلہ کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔

,,اس امر پر اھل علم کا اتفاق ہے کہ تصوف اس اشتیاق کا نام ہے جو ایک انسان (صوفی) کے دل و دماغ پر اپنے خالق حقیقی (خدا) سے ملنے کیلئے اس شدت کے ساتھ طاری ھوتا ہے کہ وہ اس کی پوری عقلی اور جذباتی زندگی پر غالب آ جاتا ہے جس کے نتیجہ میں صوفی صرف اور صرف خدا ھی کو اپنا مقصود حیات بنا لیتا ہے اسی کی باتیں کرتا، اسی کو یاد کرتا اور ھر لمحہ اسی کا کلمہ پڑھتا ہے،، ۔ (۷)

علمائے کرام اور صوفیۂ عظام کے مابین اسی نقطہ سے فرق عیاں ہونا شروع ہو جاتا ہے کیونکہ علمائے کرام اپنے کو اطاعت الٰہی اور اسکے احکام کی بجا آوری تک محدود رکھتے ہیں اور ان کے سامنے جب بھی کوئی مسئلہ آتا ہے وہ اسکے ظاہری حالات و عوامل کے مطابق احکام جاری کرتے ہیں ۔ جبکہ مشائخ کرام جنہیں اہل اللہ (اللہ والے) بھی کہا جاتا ہے وہ اطاعت کی منزل عبور کر کے محبت اور عشق کی منزلیں طے کرتے ہیں اور ان کا منتہائے نظر یہ ہوتا ہے کہ وہ فنا فی اللہ کے بلند مرتبہ کو حاصل کریں ۔ اس مقصد کے حصول میں وہ اس قدر محو اور سرگرداں ہوتے ہیں کہ ان کی زندگی کا کوئی لمحہ خالق حقیقی کی یاد سے غفلت میں نہیں گزرتا ۔ ان کا ہاتھ کار میں مشغول ہوتا ہے تو ان کا دل خالق حقیقی کی یاد میں محو ہوتا ہے ۔

ایسے عاشق زار (صوفی) کو اس کائنات میں جو کچھ دکھائی دیتا ہے وہ اسی حقیقی ذات کا پرتو ہے وہ اسی سے لو لگائے رکھتا ہے ۔ اس کائنات میں پیدا کی ہوئی ہر چیز سے وہ محبت کرتا ہے اور انسان جو اشرف المخلوقات اور زمین پر خلیفہ الٰہی ہے اس سے صوفی ٹوٹ کر اور بے پناہ انس رکھتا ہے ۔اس لئے وہ امیر و غریب کا اور اعلی و ادنی کا فرق کئے بغیر تمام انسانوں سے دلی تعلق استوار کرتا اور اسکی بگڑی سنوارنے کا عزم مصمم رکھتا ہے ۔ اس لئے تمام انسان اسکی طرف کھنچے چلے آتے ہیں اور اسکی آواز اور اسکی پکار کو اپنے دل کی آواز اور پکار سمجھتے ہیں اور اسکے پیغام کو دل و جان سے قبول کر کے نہ صرف حلقہ بگوش اسلام ہو جاتے ہیں، بلکہ ان کی زندگیوں میں ایسا انقلاب آ جاتا ہے کہ ان کی نظر میں دنیا ہیچ ہو جاتی ہے اور انسانی گروہ کا ہر فرد محترم قرار پاتا ہے یہی تصوف کی روح ہے اور یہی انسانیت کی معراج ہے ۔

یہی وجہ ہے کہ صوفیۂ کرام نہ دارالحکومتوں میں قیام پذیر ہوئے اور نہ ہی آبادیوں میں رہائش کے خواہاں ہوئے ۔ بلکہ ان کا طریق یہ رہا کہ وہ آبادیوں سے دور پہاڑوں، جنگلوں اور دریاؤں کے غیر آباد کناروں پر اپنا مسکن قائم کرتے ۔ دنیا داری اور اہل حکومت سے دور رہ کر رات بھر اللہ تعالیٰ کی یاد میں منہمک رہتے ۔دن میں مخلوق خداوندی کو اس کے خالق حقیقی سے ملاتے اور انسانیت کی خدمت میں مصروف رہتے، انہیں نہ ستائش کی تمنا ہوتی اور نہ صلہ کی پرواہ ۔ ان کی زندگی کا ایک ہی مقصد، ان کی کاوشوں کا ایک ہی صلہ ہوتا ہے کہ ان کا تعلق خالق حقیقی سے کسی لمحہ بھی ٹوٹنے نہ پائے اور ان کا پروردگار ان سے راضی ہو جائے اور ان سے محبت کرنے لگے ۔

اس پس منظر میں غور کیا جائے تو صوفیۂ کرام حکمران طبقہ اور اہل ثروت و مرتبت سے کبھی تعلقات استوار نہیں کرتے اگر انہیں اہل دنیا سے سابقہ پڑ جائے تو وہ ان سے جی نہیں لگاتے بلکہ ان سے حتی الوسع گریزاں رہتے ہیں ۔ جس کا منطقی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اہل دل (صوفیہ) حکمرانوں سے کوئی رابطہ قائم نہیں کرتے بلکہ یہ رابطہ ہمیشہ اہل حکومت کی طرف سے استوار کیا گیا اور صوفیۂ کرام سے درخواست کی گئی کہ حکمران و سلاطین کی مدد کی جائے اور انہیں درپیش مشکلات اور مسائل میں رہنمائی فراہم کی جائے ۔

حکمران وقت صوفیۂ کرام کی طرف اس لئے رجوع کرتے کہ علمائے کرام عام طور پر ظاہری امور پر حکم لگاتے اور شرعی احکام کی پابندی کرانے کیلئے سختی سے بھی کام لیتے۔جبکہ صوفیۂ کرام اس کے برعکس نرمی، مساوات اور رواداری کا مظاہرہ کرتے کیونکہ صوفیۂ کرام ظاہری احکام کی پابندی کیلئے سختی کرنے کی بجائے سلاطین میں اخلاقی اور باطنی روح پیدا کرنے کی کوشش کرتے۔ایسا

کرنے سے ممکن ہے بعض اوقات شریعت کی گرفت ڈھیلی پڑی ہو لیکن مشائخ کے اس رویہ نے انسانوں کے دلوں کو جوڑنے کیلئے اکسیر کا کام کیا ۔ اور اسلام کی اخلاقی اور روحانی تعلیم کا جو مظاہرہ آج دیکھنے میں آتا ہے یہ سب صوفیۂ کرام کی کوشش کا رھین منت ہے۔

اھل تصوف اس حقیقت سے بخوبی واقف رھے کہ ایک عـام شہری کی نسبت حکمران کی تربیت زیادہ ضروری ہے کیونکہ عام مسلمان کی اصلاح اسی تک محدود رھتی اور عام حالات میں ایک ھی انسان کی اصلاح عمل میں آتی ۔ جبکہ بادشاہ یا حکمران کی اصلاح و تربیت کے اثرات دور رس ھوتے۔اس لئے صوفیۂ کرام سلاطین کی تعلیم و تربیت اپنے عام مریدوں سے مختلف انداز میں کرتے اور بادشاھوں کو خلق خدا کی حاجت براری اور عام عدل پروری کی زیادہ تلقین کرتے چنانچہ خواجہ معین الدین چشتی کی عام تعلیم تھی کہ حاجت مندوں کی مدد کرنے والا اللہ تعالیٰ کا دوست ہے۔اگر کوئی شخص ورد و وظائف میں مشغول ھو اور حاجت مند آ جائے تو لازم ہے کہ وہ اوراد و وظائف کو چھوڑ کر اس کی طرف متوجہ ھو کر اپنے مقدور کے مطابق اس کی حاجت پوری کرے ۔ (۸)

مشائخ کرام کی تعلیـم و تلقیـن کے یہ اثـرات مرتـب ھوئے کہ ھندوستان میں غزنویوں اور غوریوں نے عدل و انصاف کی جو روایت قائم کی اسے بعد کے حکمرانوں کو برقرار رکھنا پڑا کیونکہ بیان کیا جاتا ہے کہ قطب الدین ایبک نے سخاوت میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی اور عدل میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی تقلید کرنے کی کوشش کی اور ایلتتمـش کی طرف سے عام اجازت تھی کہ اس کی رعایا میں سے جو شخص فاقہ کی حاجت میں ہے اسے بلا روک ٹوک اسکے ھاں لایا جائے ۔ جب بادشاہ کسی فاقہ زدہ افراد سے ملتا تو اسے اپنے پاس سے کچھـ نہ کچھـ مال دیتا اور اس کی غربت اور تنگ

دستی کو ختم کرنے کی تدبیر کرتا ۔ مغلوں نے عدل پروری اور خلق خدا کی خدمت کی روایت کو قائم رکھا چنانچہ بابر نے اپنی تزک میں تحریر کیا ہے کہ جب اسکی فوج بھیرہ سے گذری تھی تو اسے معلوم ہوا کہ فوجیوں نے بھیرہ والوں کو ستایا ہے اور ان کی جائداد پر ہاتھ ڈالا ہے۔بابر نے ایسے سپاہیوں کو گرفتار کیا، ان کا کورٹ مارشل کیا اور ان میں سے بعض کی ناکیں کٹوائیں اور بعض کو سزائے موت تک دی ۔ اسی طرح ابوالفضل کا بیان ہے اکبر نے دن کا کچھ حصہ عدل کیلئے مخصوص کر رکھا تھا۔جبکہ جہانگیر روزانہ دو گھنٹے عوام کی شکایات سنا کرتا تھا ۔ جو شبلی کی نظم ,,عدل جہانگیری،، سے بھی عیاں ہے ۔ دیگر مغل بادشاہوں کا یہ طریق کار رہا کہ وہ دیوان عام میں عوام کی شکایات سنا کرتے تھے ۔ جہاں ہر درجہ کے شہریوں کو پہنچنے اور اپنی شکایات بیان کرنے سے کوئی نہیں روک سکتا تھا ۔

مختصر طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہندوستان کے اسلامی دور میں صوفیۂ کرام نے حکمرانوں سے ایسے کام لئے جن کی بدولت اسلام کے معاشرتی اور سماجی احکام کا نفاذ ہوتا رہا ۔ جن کی بدولت برصغیر میں مسلمانوں کی حکومت طویل عرصہ تک قائم رہی۔

صوفیۂ کرام کی بادشاہوں کو نیکی کرنے کی تلقین اور ان کے تمام سماجی طبقوں سے براہ راست تعلقات اور ان کی روحانی تعلیمات کی بدولت ایک ایسا معاشرہ وجود میں آیا جسے بجا طور پر عمدہ معاشرہ کہا جا سکتا ہے اور صوفیۂ کرام کے ذاتی عمل نے سماجی برائیوں کا قلع قمع کرنے کیلئے اہم کردار ادا کیا ۔

سلاطین اور صوفیۂ کرام کے تعلقات پر غور کیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ دونوں اپنی اپنی اقلیم کے بادشاہ ہوتے تھے ۔ سلاطین رعایا کے جسموں پر حکومت کرتے تو مشائخ ان کے دلوں کے حکمران ہوتے تھے اور دلوں کی حکمرانی زیادہ مضبوط اور دیرپا ہوتی ہے۔حکمران

عام طور پر صوفیۂ کرام سے خائف رہتے اور ان کی عوامی مقبولیت سے حسد بھی کرتے ۔ بعض اہل حکومت نے یہ کوششیں بھی کیں کہ مسلمانوں کو صوفیۂ کرام سے متنفر کریں اسکے برعکس اہل تصوف اہل حکومت سے کوئی تعلق نہیں رکھتے تھے ۔ بلکہ وہ اللہ تعالیٰ اور مخلوق خدا سے اپنا رشتہ قائم رکھتے اور اہل حکومت سے الجھنے کی کوشش نہیں کرتے تھے ۔ بلکہ اہل حکومت کی اصلاح کی تدابیر کرتے رہتے تھے ۔

بعض اہل حکومت اور صوفیۂ کرام کے درمیان تصادم کی مثالیں بھی ملتی ھیں جسکی ایک مثال سیدی مولا کا قتل ہے جو جلال الدین خلجی کے دربار میں قتل کر دیئے گئے تھے ۔ خواجہ نظام الدین اولیاء بادشاھوں سے ملنا پسند نہیں کرتے تھے ۔ اس لئے ان کی اس عادت کی وجہ سے بھی اختلاف پیدا ھوا لیکن واضح رھے کہ یہ اختلاف کسی نظری اور فطری مسئلہ پر نہیں بلکہ ذاتی قسم کا ھوتا تھا ۔

یہ گفتگو اس وقت تک تشنہ رھے گی جب تک تعلقات کی مثلث کے تیسرے پہلو یعنی علمائے کرام اور صوفیۂ عظام کے باھمی تعلقات پر روشنی نہ ڈالی جائے ۔ بظاھر یہ موضوع بہت نازک اور الجھا ھوا ہے ۔ تاھم کوشش کی جائے گی کہ اسے کم از کم الفاظ میں سمیٹا جائے ۔

علماء اور صوفیۂ کے تعلقات پر غور کرنے سے پہلے ایک امر کی وضاحت ضروری معلوم ھوتی ہے کہ تصوف اسلامی تعلیمات کا حصہ ہے اور اکابر صوفیۂ کرام ایسے نہیں ھوتے تھے کہ انہیں دینی تعلیم سے کوئی سروکار نہ ھو اور وہ صرف تصوف کی تعلیم حاصل کرتے تھے ۔ برصغیر میں شریعت اور طریقت کی دو الگ الگ اصطلاحات استعمال کی جاتی رھیں ۔ لیکن اس کا یہ مفہوم نہیں کہ اھل تصوف